رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

جمادی الثانی ۱۳۷۳ھ　　　　جلد ۴۱ عدد ۶

ماهنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے　　　　قیمت فی پرچہ

مطبوعات جماعت اسلامی پاکستان

مذہب اخلاق

دینیات	۰	۲
خطبات	۸	۳
اسلامی عبارات پر تحقیقی نظر	۰	۱
تفہیمات حصہ اول	۰	۴
تفہیمات حصہ دوم	۰	۷
حقیقت شرک	۸	۲
حقیقت توحید	۴	۱
حقیقت تقوی	۱۲	۰
مسئلہ جبرو قدر	۴	۱
بناؤ بگاڑ	۶	۰
اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر	۶	۰
اسلام اور جاہلیت	۶	۰
تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۸	۰
سلامتی کا راستہ	۶	۰
دین حق	۶	۰
شہادت حق	۶	۰
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۸	۱
حقیقت نماز	۸	۰
فردوس کی راہ	۱۲	۱

سیاست

الجہاد فی الاسلام	۰	۹
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول (زیر طبع)	۴	۱
,, ,, حصہ دوم	۸	۲
,, حصہ سوم (زیر طبع)	۸	۲
مسئلہ قومیت	۸	۱
اسلام کا نظریہ سیاسی	۶	۰
جہاد فی سبیل اللہ	۶	۰
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۶	۰
اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر (زیر طبع)		
مرتد کی سزا	۱۲	۰
مطالبہ نظام اسلامی	۳	۰
آزادی کے اسلامی تقاضے	۲	۰

سلسلہ اسلامی ریاست

کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف	۱۴	۰
شہریت کے حقوق و فرائض	۰	۱
اطاعت کے شرائط و حدود	۱۰	۰
غیر مسلموں کے حقوق (زیر طبع)		

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۱	جمادی الثانی ۱۳۷۳ھ مطابق مارچ ۱۹۵۴ء	عدد ۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(پچھلی اشاعت کے اشارات میں جو بحث نا تمام رہ گئی تھی یہ اسی کا بقیہ ہے)

حلقۂ کراچی و سندھ کی جماعت اسلامی کے امیر سے اس موقع پر بڑا گناہ کبیرہ سرزد ہو گیا کہ ان کے قلم سے ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا جس میں اسلامی دستور کے سب سے پہلے علمبردار ملک کے دارالسلطنت میں منعقد ہونے والی ان غیر اسلامی تقاریب پر اظہارِ رائے کیا گیا تھا۔ اس گناہِ کبیرہ پر ان تقاریب کے مہتمم صاحب نے جس شان سے اظہارِ عتاب فرمایا ہے اور ے دے کی ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کی ایک جھلک بھی دکھا دیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"ہم نے حلقۂ سندھ و کراچی کی جماعت اسلامی کے امیر کے بیان کو گہرے اضطراب کے ساتھ دیکھا جو نیشنل آرٹ گیلری کے لیے ہماری چندہ جمع کرنے کی مساعی سے متعلق ہے۔

یہ بیان اندھی مذہب پرستی، جہالت اور تاریخی حقائق کی قطعی الٹی تعبیر کا ایک مثالی نمونہ ہے۔

اس میں "اسلامی اخلاقیات کے لیے خطرہ" کا نعرہ لگا کر مذہب کو خواہ مخواہ گھسیٹ لایا گیا ہے۔

کراچی میں "پیرس کی فضا" بنانے کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جیسے پیرس برائی اور ناشائستگی کا مرکز ہے ـــــ حالانکہ پیرس آرٹ اور کلچر کے وسیع خزانوں سے مالا مال ہونے کے

ٰ کس کمال سے ایک "قومی مقصد" (جو اسلامی پھر بھی نہیں ہے) کو آگے کر دیا گیا ہے۔ یہی حکمت اس طرح کے تمام معاملات میں اختیار کی گئی ہے۔ مثلاً مینا بازار لگتا ہے تو اس کے ساتھ کسی اسکول کے قیام کے لیے چندہ کا دم چھلا لگا دیا جاتا ہے۔ "اپوا" کی کلچرل سرگرمیاں ہیں تو ان کا جوڑ تعلیم و صحت کے سلسلے کی کچھ سوشل سروسز سے لگا ہوا ہے۔ اب اگر آپ کسی غیر اسلامی تقریب کی طرف اعتراض کی انگلی اٹھائیں تو کہا جائے گا کہ واہ صاحب وا۔ ایسی اہم خدمات کو انجام دینے کے لیے جو لوگ کام کر رہے ہیں، ان کے راستے میں اسلام کے نام پر روڑا اٹکایا جاتا ہے۔

لحاظ سے دنیا کے شہروں میں یہ مشکل ہی اپنا کوئی ثانی رکھتا ہے۔

—— یہ غلط ہے کہ آرٹ مسلم تاریخ میں واجد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں نمودار ہُوا۔ جی نہیں! یہ تو مسلمانوں کے دورِ عروج میں اُبھرا ہے۔ ایرانی اور مغل مراکزِ فن دورِ زوال میں پیدا نہیں ہوئے۔

—— تمام "ترقی پسند" مسلم ممالک، خصوصاً مصر و ترکیہ میں براہِ راست ریاست کی سرپرستی اور مالی اعانت سے فنی سرگرمیوں کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

—— قومیں جو اسلام کو اپنا مذہب نہیں مانتی ہیں، وہ اخلاق و کردار کے جن اصولوں کے بل پر عظمت حاصل کیے ہوئے ہیں، —— کاش کہ ہم نے اتنی مدت تک ان اصولوں سے صرفِ نظر نہ کیا ہوتا۔

—— یہ خصوصیت صرف جہلا کی ہو سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے اخلاق و سیرت کی بنیادوں کو سمجھے بوجھے بغیر اُن پر اپنے اخلاقی نظریات کو ٹھونسنے کی کوشش کریں۔

—— کراچی کے فن کار سیرت و کردار کے اونچے اسلامی اصولوں کے تحفظ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

—— اُن کو اپنے مشاغل میں مگن رہنے اور پاکستان اور اس کے دارالسلطنت کے بہم پہنچائے ہوئے حقوق اور سہولتوں سے فائدہ اُٹھانے کا ویسا ہی حق حاصل ہے، جیسا جماعتِ اسلامی کے ارکان کو۔

—— اگر جماعتِ اسلامی کے ارکان فن کارانہ سرگرمیوں کو فروغ دینے میں ہماری مساعی کو پسند نہیں کرتے تو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی پسند کی جنت کسی دوسری جگہ جا کر بنائیں۔

—— خاتمۂ کلام پر ہم اپنے محبوب وزیرِ اعظم اور گورنر سندھ اور دوسرے زعماء کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا پُر نوازش اور پُر جوش تعاون ہمیں بہم پہنچایا، جو اگر حاصل نہ ہو تو پاکستان میں آرٹ اور کلچر کی ترقی کے لیے کوئی تحریک کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔

—— یہ ہماری دلی تمنا ہے کہ پاکستان بغیر مذہبی تعصب اور تنگ نظری کی خلل اندازی کے ترقی کی راہ پر بڑھتا چلا جائے۔

اس عبرتناک بیان کو پڑھیے اور غور سے پڑھیے، اور ہو سکے تو اس کے آئینے میں "اسلامیت"

کے اُن تصورات کی جھلک دیکھنے کی کوشش کیجیے جو اسلام کا نام لیتے ہوئے دلوں میں مخفی رکھا جاتا ہے۔

اس میں دیکھنے کی سب سے اہم چیز وہ "شکریہ" ہے جو خاتمے پر ہمارے "اکابر" کو پیشکش کیا گیا ہے۔ یوں تو یہ شکریہ ہے، لیکن امیر جماعت اسلامی کراچی و سندھ کی طرف روئے سخن کر کے اسے پیش کرنے سے یہ جتانا مقصود ہے کہ جانتے ہو ہماری فن کارانہ سرگرمیوں کی پشت پناہی کرنے والے کون کون لوگ ہیں، ہماری سرپرستی کیسی کیسی قوتیں کر رہی ہیں ------ وزرا اور گورنر!

یہی وہ احساس ہے جس نے صاحب بیان میں غیر معمولی درجے کی جسارت پیدا کر دی ہے۔ وہ اس بیان میں اسلام، دستور پاکستان، جمہور کے رجحانات وغیرہ سے بہت اونچا اُٹھ کر بات کر رہا ہے۔ اس "احساس قوت" سے لفظ لفظ کا پیالہ لبریز ہے۔ اسی کی وجہ سے سارا بیان ایک چیلنج کا مزاج رکھتا ہے یعنی کہا یہ جا رہا ہے کہ جب ملک کے وزیر اور گورنر اس راستے پر فنون لطیفہ کا قافلہ جلوس لے کر چل کھڑے ہوئے ہیں تو پھر دینی رجحانات ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں اور دستوری رپورٹ کے رہنما اصول ہمارے قدم کیونکر روک سکتے ہیں؟ ---- سیّاں بھئے کوتوال، اب ڈر کاہے کا!

اس بیان کی گہرائی میں اسلامی قدروں کو پسند کرنے والوں کے لیے دھمکی بھی موجود ہے یعنی اثر یہ ڈالنا مطلوب ہے کہ اس کام کی پشت پر وزیر اعظم اور ایک صوبائی گورنر اور دوسرے اکابر ہیں جو حاکمانہ اختیارات رکھتے ہیں اور جو سیکورٹی ایکٹ اور سیفٹی ایکٹ سے مسلح ہیں۔ یہ دھمکی آخر میں جا کر بالکل کھلا کھلا انداز اختیار کر گئی ہے۔ یعنی جس کسی کو فینسی ڈریس شو اور نقابی ناچ اور مینا بازار جیسے رنگین ہنگامے پسند نہ ہوں اس کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہے[1]۔

یہ بیان آئینہ ہے اُس قلیل التعداد مگر طاقت پائے ہوئے فرنگیت مآب عنصر کے ذہن کا جو ایک ہی وقت میں اسلام کے نعرے بھی لگاتا ہے اور اسلام کو پامال بھی کرتا ہے۔ نام کتاب و سنت کا لیتا ہے

---

[1] اس سے پہلے ایک دھمکی سکھر میں گرلز ہائی سکول کی غیر اسلامی سرگرمیوں کے سلسلے میں وصی مظہر صاحب کے ایک بیان پر سندھ کے ایک وزیر صاحب کی طرف سے دی جا چکی ہے۔ انہوں نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ جو ہماری ان سرگرمیوں میں آڑے آئے گا ہم اسے سختی سے دبا دیں گے۔ اسی کو کہتے ہیں اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے!

اور سرچشمۂ ہدایت پیرس کو مانتا ہے۔ مذہب کا خادم بھی بنتا ہے اور مذہب کو تنگ نظری اور تعصب کا نام بھی دیتا ہے۔ پھر جب اُس کا یہ تضاد لوگوں میں اضطراب پیدا کرتا ہے تو یہ ان کو دھمکیاں دیتا ہے۔

ہم صاحبِ بیان اور اس کے فن پرست طبقے کا نفسیاتی تجزیہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

(۱) پیرس آرٹ اور کلچر کے وسیع خزانوں سے مالا مال ہوگا، ہزار مرتبہ ہوگا، لیکن کیا وہ آرٹ اور کلچر اسلام کا ترجمان ہے؟ اس میں قرآن بولتا ہے؟ اس میں سنّت اپنا اظہار کرتی ہے؟ اس میں انبیا کی تعلیم گندھی ہوتی ہے؟ اُس میں وہ کونسا جزء ہے جس کی وجہ سے ہم اُس پر فریفتہ ہوں۔

(۲) کیا واقعہ یہ نہیں ہے کہ آرٹ اور کلچر کے اس تاروں کو گذشتہ جنگ عظیم میں بودا ثابت کرنے اور بالکل تیسرے درجے کی طاقت بنا دینے میں منجملہ دیگر اسباب کے خود اس آرٹ اور کلچر کا بھی بڑا حصہ ہے؟

(۳) مسلم ہسٹری میں آرٹ اور کلچر کا ظہور واجد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کے دور سے بہت پہلے ہوا ہی، لیکن کیا آپ اس کے سرچشمے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا ابوبکر صدیقؓ، یا عمر فاروقؓ، یا عثمان غنیؓ، یا علی مرتضیٰؓ، کے دور میں دکھا سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہر وہ چیز جو مسلمان بادشاہوں میں سے کسی کے دور میں ہمارے ہاں نمودار ہوگئی ہو وہ از خود "اسلامی" ہو جائے گی؟ ہماری تاریخ میں سازشیں بھی ہوئیں، قتل بھی ہوئے، زہر خورانی بھی ہوئی، جور و تشدد بھی ہوا، لعنتیں بھی مچی، زنا بھی ہوئی، عیاشیاں بھی کی گئیں، غداری کے واقعات بھی ہیں، وعدہ خلافیاں اور دھوکے بھی کیے گئے ہیں، سلب و نہب بھی ہوا ہے، ائمۂ امت کو ستایا بھی گیا ہے، تو کیا یہ سب کچھ "اسلامی" بھی ہو گیا؟ کسی چیز کے اسلامی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت اور پھر نیچے آکر کم سے کم سنّت خلفائے راشدین اسے جائز قرار دے۔ اور کوئی چیز یہاں حجت نہیں ہے۔

(۴) مصر اور ترکیہ اور دوسرے مسلمان ممالک کا کسی چیز کو اختیار کر لینا اگر اسلامیت کی سند ہے تو پھر ماشاء اللہ ان مآخذ سے وہ ماڈرن اسلام ہاتھ آئے گا کہ رہے نام اللہ کا!

(۵) آپ کا یہ فرمانا کہ "اخلاق و کردار کی قدریں جو کسی قوم کو عظمت دیتی ہیں کسی ایک مذہب

کا اجارہ نہیں" —— اس حقیقت کے انکار پر مبنی ہے کہ "ان الدین عند اللہ الاسلام" (اللہ کے نزدیک تو دین (نظامِ حیات) بس اسلام ہی ہے) اور اس حقیقت کے بھی انکار پر مبنی ہے کہ پہلے اسلام کی امانت جن قوموں کی تحویل میں دی گئی تھی انہوں نے خیانت کر کے اسے مسخ کر ڈالا ہے اور اُس کا ایک حصہ ضائع کر دیا ہے۔ پھر آپ کا یہ ارشاد کہ اسلام کے بغیر بھی مغربی قومیں عظمت یافتہ ہیں، اس امرِ واقعہ سے لاعلمی پر مبنی ہے کہ ان قوموں کو جہاں ایک طرف سے مادی ترقی حاصل ہے وہاں دوسری طرف اخلاقی مفاسد کا گھن بھی انہیں کھا رہا ہے۔

(۶) یہاں کسی کی طرف سے اپنے نظریات کو دوسروں پر لادنے کا سوال نہیں، یہاں تو صورتِ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی اکثریت نے اپنی اجتماعی مرضی کا اظہار کرتے ہوئے دستوری رپورٹ کی قراردادِ مقاصد اور اس کے رہنما اصولوں میں اُن اخلاقی نظریات و تصورات کو صراحت سے پیش کر دیا ہے جن پر وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو ڈھالنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنا سرچشمۂ ہدایت صرف خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنّت کو قرار دیا ہے —— مسلمان بادشاہوں کی تاریخ، مصر اور ترکی اور پیرس کے آرٹ کے خزانوں کو نہیں! —— اُس نے ایک ایسی فضا بنانے کا فیصلہ کیا ہے جس کے اندر مسلمان اپنی زندگیاں اسلام پر استوار کر سکیں، اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ نہیں میں اس فیصلے کو نہیں مانتا اور میں تو ایسی فضا میں زندہ رہنا پسند نہیں کرتا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے لیے کوئی دوسری بہتر جگہ تلاش کرے۔

(۷) یہاں اسلام اور اسلامی اخلاق اور اسلامی قدروں کے بارے میں ایک متفقہ اجتماعی تصور دستوری جامہ پہن رہا ہے، اور اس تصور کو حکومت کا ایک ایک شعبہ اور اکثریت کا ایک ایک فرد لے کے چلے گا اور اس کی پاسبانی کرے گا اور اسے نقصان پہنچانے والی ہر مفسد طاقت سے ماحول کو پاک کرنے میں حصہ لے گا۔ اب یہ قوم کی قوم اسلام کے معروف کو قائم کرنے اور اسلام کے بتائے ہوئے منکر کو محو کرنے میں ہمہ تن لگ جائے گی۔ اب یہاں مذہب و اخلاق نجی معاملہ نہیں، ایک اجتماعی مسئلہ ہو گا۔ اب کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میرا اپنا ایک تصورِ مذہب و اخلاق ہے جس میں

کسی دوسرے کو مداخلت کا حق نہیں۔ ایک شخص اٹھے اور یہاں کاشی اور متھرا کی فضا بنانا چاہے، دوسرا یہاں پیرس کا ماحول تیار کرنے میں لگ جائے، تیسرا یہاں ننگا کلب قائم کرے، چوتھا غسل آفتابی کی تحریک شروع کر دے ــــ اب اس طرح کی آزادئ نظریات و کردار کا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ یہاں جو بھی کوئی اقدام یا حرکت کرے گا اسے ثابت کرنا ہوگا کہ یہ اسلام کا تقاضا ہے اور عین کتاب وسنت کے مطابق ہے۔ ورنہ پوری قوم اس کی مزاحمت کرے گی، دستور اس کی مزاحمت کرے گا، حکومت اپنی ساری طاقتوں سے اس کی مزاحمت کرے گی۔

(۸) بہت دلچسپ ہے کراچی کے فن کاروں کا یہ ادّعا کہ وہ اسلام کے بلند اصولِ اخلاق کے تحفظ میں پیش پیش ہیں۔ جی ہاں! اسلام کے اصولِ اخلاق کا تحفظ فینسی ڈریس شو اور ثقافتی ناچ سے زیادہ اور کن سرگرمیوں کے ذریعے ہوتا ہوگا۔

(۹) "آزادی" اور "حقوق" کا یہ انوکھا تصور کہ اسٹیٹ جن اصول و مقاصد پر قائم ہو رہا ہے ان کی دھڑلے سے توہین و تخریب کی جائے اور مسلمان کہلا کر بلکہ اسلام پر کچھ نہ کچھ احسان دھر کر کی جائے، سے برسرِعام بیان کرکے تو آرٹ کا مثالی نمونہ پیش کیا گیا ہے یعنی آپ کا خیال یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں کو خود اپنی بیخ کنی کی اجازت بھی دیتا ہے اور اسلامی ریاست خود اپنی تخریب کے حقوق بھی اپنے مسلم شہریوں کو دیتی ہے۔ آزادی سے مراد اگر اسلام سے آزادی ہے اور حقوق سے مراد اگر اسلامی ریاست کی جڑیں کھودنے کے حقوق ہیں تو ایسی آزادی اور ایسے حقوق کے لیے بس پیرس ہی کی فضا موزوں رہے گی، پاکستان میں آپ مشکل ہی حقوق حاصل کر سکیں گے۔

ہماری نوخیز اسلامی رائے عام آج جیسی کچھ بھی ہو، عنقریب یہ ایک طوفانی قوت ہوگی اور اسلام اور پاکستان کے ساتھ وہ اس طرح کا مذاق گوارا نہیں کرے گی۔

(۱۰) جب تک پاکستان کا دستوری مزاج سیکولر تھا تو بلاشبہ اس کی ترقی مذہب سے آزاد اور منحرف ہوکر آگے بڑھنے ہی میں تھی اور اس میں ہر مذہبی مداخلت پر تعصب اور تنگ نظری کی پھبتی کسنے کا کھلا موقع تھا، لیکن اب صورت بالکل برعکس ہے، یعنی اب اسلام کی زیادہ سے زیادہ پابندی سے ترقی نمودار

ہوگی اور اس ترقی میں الحاد اور فسق کی مداخلت بے جا تعصب اور تنگ نظری کی تعریف میں آئے گی اور ایسی مداخلت کرنے والے عناصر سوسائٹی میں اچھوت بن کے رہ جائیں گے۔

(۱۱) آپ قوم کے اکابر کو غیر اسلامی ہنگامہ ہائے رنگین کی پشت پہ دکھا کر بادہ شادماں نہ ہوں کیونکہ اگر آپ جیسے لوگوں نے ان کو غلط فہمیوں میں ڈال کر اکثریت کے جذبات و احساسات سے لڑا دیا تو اس سے خود انہی کو نقصان پہنچے گا۔ یہاں اب پائداری، قوت، اعتماد اور عوامی تعاون وہی قیادت حاصل کر سکے گی جو اخلاص سے اسلامی نظام کو قائم کرنے میں سرگرم عمل ہو۔ جو قوت بھی کھلے کھلے اسلامی نعروں کے ساتھ اسلام کو پامال کرے گی وہ پاکستان کی فضا میں کبھی قدم نہیں جما سکتی۔ پس براہِ کرم اکابر کو غلط مشورے نہ دیجئے۔

اوپر ہم نے جن ناخوشگوار واقعات کا نوٹس لیا ہے، ہمارے لیے اُن کا تذکرہ کرنا بھی بڑا ناخوشگوار کام ہے۔ ہم اپنی زبان اور اپنے قلم کو، اور بالخصوص ترجمان القرآن جیسے جریدے کے صفحات کو اُن واقعات کے بیان میں استعمال کرنے پر اپنے آپ کو بڑی مشکل سے تیار کرتے ہیں۔ اپنے اکابر قوم جن کے بہرحال ہم کبھی بدخواہ نہ تھے ــ کی کمزوریوں کا تذکرہ کرنا اور ان کا ناقدانہ تجزیہ کرنا کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں ہے کہ اس سے مزہ لیا جا سکے۔ یہ ایک تکلیف دہ فرض ہے جسے چار و ناچار ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس تذکرے کا منشا صرف یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کی مسلم لیگی قیادت پر یہ واضح کر دیں کہ آپ کی قوم نہ صرف یہ کہ ان چیزوں کو سخت ناپسند کرتی ہے، بلکہ "اسلامی دستور" کا جو عملی مفہوم وہ ان سرگرمیوں کے آئینے میں دیکھتی ہے اس کی وجہ سے اس میں ایک بددلی، بے اعتمادی، جمود اور بیا او قات شدید اضطراب پیدا ہونے لگتا ہے۔ یوں جب عوام کا اطمینان درہم برہم ہو جاتا ہے تو ان کے اندر ہر مفسد عنصر کو قدم جمانے اور مختلف ناپسندیدہ رجحانات پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔ قول اور فعل، نعروں اور اقدامات، دستوری فیصلوں اور عملی سرگرمیوں کا یہ خوفناک اور کھلا تضاد قیادت کے لیے کسی حال میں بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ بس یہ حقیقت ہے جسے خیر خواہی اور اخلاص کے ساتھ ہم سامنے لانا چاہتے ہیں۔

اصول پسندی، معقولیت اور اخلاص کے راستے کے سوا کسی قیادت کے لیے پائداری، عوامی اعتماد اور قوم کے تعاون کے حصول کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ہم اپنے اکابر کو اسی راستے پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس راستے پر چلنا ہو تو پھر اپنے حقیقی ایمان اور نظریے اور پسند کے خلاف کبھی کوئی ایسی بات نہ تسلیم کیجیے، نہ اپنے نعروں میں شامل کیجیے، نہ دستوری فیصلوں میں داخل کیجیے، نہ اپنی تقریروں کو مزین کرنے میں استعمال کیجیے جس پر عمل کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ اکثریت اگر ایسی کسی بات کے لیے تقاضا اور اصرار کرے تو اسے سمجھائیے، اسے دلائل دیجیے، اسے اپنی رائے سے متاثر کیجیے، اس کے رجحانات کی غلطی (اگر ہو تو) اس پر واضح کیجیے، اُس کا ضمیر بدلئے، اس کے سوچنے سمجھنے کے انداز میں تغیر پیدا کیجیے اور اس کا ذہنی تعاون اپنے ایمان اور نظریات، اپنے ترقی کے تصورات، اپنے آرٹ اور کلچر کے ذوق کے لیے حاصل کیجیے۔ پھر اگر لادین سیاسی نظام، فرنگی معاشرت، پیرس کے آرٹ اور کلچر، کراچی کے فنکاروں کے اصولِ اخلاق و سیرت اور فینسی ڈریس شو اور تقابلی ناچ کے لیے رائے عام ہموار ہو جائے تو علی الاعلان اپنے نعروں اور تقریروں اور دستوری فیصلوں کے ذریعے اپنے عزائم کو لے کے اٹھیے۔ پورے زور سے انہیں قول میں بھی لائیے اور عمل سے بھی پیش کیجیے۔ بخلاف اس کے اگر اکثریت کی رائے کو آپ اپنے ایمان اور نظریات اور تصورات اور عزائم کے حق میں ہموار نہ کر سکیں تو اخلاص و دیانت کے مطابق جمہوری راہ یہ ہے کہ اقتدار کی کرسیاں خالی کر کے اکثریت کو آپ موقع دیں کہ وہ اپنے ایمان اور نظریات اور تصورات کے تحت زندگی کی تعمیرِ نو کے لیے جن معماروں کی خدمات حاصل کرنا چاہتی ہو کر لے۔

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اکابر یہی نہیں کرتے۔ اب دیکھیے کہ دستور میں اسلام کے تقاضوں کو رہنما اصول قرار دینے کے بعد جہاں ایک طرف فراری ذہنیت کے سارے مذکورۂ بالا کرشمے ہمارے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں وہاں اسلام کو برابر تقریروں اور نعروں کے لیے سامانِ آرائش بھی بنایا جا رہا ہے۔ حال ہی میں کراچی میں سائنس کانفرنس کے دوران انعقاد میں تعلیم کے مسئلے پر بھی ایک مجلس مشاورت (SYMPOSIUM) منعقد ہوئی تھی۔ اس میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین (سابق وزیر تعلیم) نے جو اظہارِ خیال کیا ہے اور جس پر اتفاقِ رائے پایا گیا ہے اس میں حسب ذیل نکات بڑے

اہم ہیں :-

—— اسلام نجی مذہب نہیں بلکہ مکمل نظام زندگی ہے۔

—— اسلامی اصولوں پر اگر معاشرے کی تعمیر کی جائے اور جمہور کے اخلاق کو ان کی بنیاد پر اٹھایا جائے تو ایک ایک خرابی کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔

—— اس مقصد کے لیے ناگزیر ہے کہ تعلیم جو اب تک بے مقصد چلی آ رہی ہے، اسے اسلامی اصولوں پر استوار کر کے بامقصد بنایا جائے۔

—— ہمارے نظامِ تعلیم کا مزاج اسلامی ہونا چاہیے۔

دیکھیے کہ کتنی اچھی باتیں ہیں، کتنی سچی باتیں ہیں، یہ اکثریت کے رجحانات سے کتنی مطابقت رکھتی ہیں۔ لیکن ان باتوں کا مفہوم جب لوگ عملی سرگرمیوں کے لغت میں دیکھتے ہیں تو بالکل برعکس ملتا ہے۔

پھر، ابھی گنتی کے چند روز بیتے ہیں کہ ہمارے وزیرِ اعظم نے مشرقی پاکستان کی ناسازگار انتخابی فضا کو دیکھ کر عوام کے جذبات کو اپیل کرنے کے لیے یہ نعرہ لگایا کہ "ہم سب ایک خدا، ایک قرآن اور ایک حدیث کو ماننے والے ہیں" لہٰذا ہمیں باہم متحد اور ہم آہنگ رہنا چاہیے۔ کتنا صحیح نعرہ ہے، کتنی اچھی اسلامی اپیل ہے! لیکن یہ کما حقہٗ نتیجہ اس لیے نہیں دکھاتی کہ پاکستان کے عوام جس خدا اور جس قرآن و حدیث کو مانتے ہیں اس کے دین میں اُن ہنگاموں کی کھپت نہیں ہے جن سے ابھی ابھی وزیرِ اعظم فارغ ہو کر انتخابی میدان میں پہنچے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ برسرِ اقتدار عنصر کا خدا اور اس کے قرآن و حدیث کوئی اور ہوں گے جو پیرس کو سرچشمۂ تہذیب قرار دیتے ہیں، جو مغربی عریانی و بے حیائی کو آرٹ اور کلچر کا نام دیتے ہیں، جو اخلاقی تصورات میں ہر ایک کو کھلی چھوٹ دیتے ہیں، جو دین کی پابندی و احترام کو جہالت، اندھی عقیدہ پرستی اور تنگ نظری کی تعریف سے پیش کرنے کا درس دیتے ہیں۔ بنائے اتحاد خدا اور قرآن اور حدیث کا لفظی نعرہ نہیں ہو سکتا، وہ عملی یک جہتی، فکری ہم آہنگی اور اخلاقی یکسانی ہو سکتی ہے جو خدا اور قرآن اور حدیث کی تعلیم سے عالمِ واقعہ میں رونما ہو۔ وہ کہاں ہے؟

آخر محض بے معنی لفظوں کے کھوٹے سکے کب تک چلائے جا سکتے ہیں!

اصول پسندی، معقولیت اور اخلاص کا تقاضا دوسرے پہلو سے یہ ہے کہ جس چیز کو آپ زبان سے تسلیم کریں، جسے اپنے عزائم کا جزء بنالیں، جسے دستوری فیصلے کی حیثیت دے دیں، پھر اس کے مطابق اپنے ایمان و نظریہ میں بھی حقیقی تبدیلی پیدا کریں اور اپنے عمل و کردار سے بھی اسی کو فروغ دینے کی جدوجہد کا مظاہرہ کریں۔

یقین جانیے کہ اگر آپ اپنے اسلامی نعروں اور تقریروں اور دستوری فیصلوں کے مطابق ذہن و عمل کی تبدیلی کا مظاہرہ کریں تو پوری کی پوری قوم آپ کے ساتھ تعاون ہی نہیں کرے گی، آپ پر فریفتہ ہوگی، آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی اور ایک ایسی مقبولیتِ عام کے دروازے آپ کے لیے کھل جائیں گے کہ جس کا اب تک آپ حضرات تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ مقبولیت پا کر اگر آپ اس قوم سے کوئی اپیل کریں گے تو بچہ بچہ اس پر لبیک کہے گا، پھر اگر آپ اتحاد کے لیے پکاریں گے تو کوئی ایک فرد بھی اختلاف نہیں کرے گا، آپ کسی فنڈ کا مطالبہ کریں گے تو لوگ اپنے اوپر فاقے گوارا کر کے بھی آپ کی جھولیاں بھر دیں گے، آپ دفاع کے لیے بلائیں گے تو ساری قوم سروں پر کفن باندھے نکل کھڑی ہوگی، آپ مناصب سے بھاگنا بھی چاہیں گے تو لوگ زبردستی یہ بوجھ آپ ہی کے کندھوں پر رکھیں گے۔ ہر طرف ایک نیا جذبہ امڈ پڑے گا، ترقی کی رَو دوڑنے لگے گی، قومی عظمت کے نئے سرچشمے اُبلتے دکھائی دیں گے اتحاد اور ڈسپلن کا ایک نیا معیار قائم ہونے لگے گا، مفسد عناصر کے لیے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنا سرے سے ممکن نہ رہے گا۔ اور لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لیے کسی استبدادی قانون کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔

اس مقبولیت کو حاصل کرنے کا ایک زرّیں موقع پہلے بھی آیا تھا۔ قرارداد مقاصد کے پاس ہونے کے بعد ساری قوم میاں عمل میں قیادت کی طرف سے ایک نئی تبدیلی پیدا کر دکھانے کی امیدیں لگائے بیٹھی تھی لیکن ایک بھاری کریڈٹ حاصل کرنے کا وہ زرّیں لمحہ اس الٹی روش نے غارت کر دیا جس کے خلاف قراردادِ مقاصد کا ایک ایک لفظ کرب سے چیخ اٹھا۔ اب یہ موقع پھر آیا ہے۔ دستوری رپورٹ کے رہنما اصولوں کو دستبرداریہ چور دروازے بند کر دیے جائیں) پاس کر کے اگر ہماری قیادت فکر و نظر، اور عمل و کردار کی حقیقی تبدیلی کا ثبوت دے اور اسلامی معاشرہ کی بنیادیں رکھنے میں صحیح صحیح حصہ ادا کرے تو اس قوم کا صدفی صد اعتماد، اس کا

مکمل تعاون اور اس کی پوری کی پوری اطاعت انہیں حاصل ہو سکتی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ کاروانِ عمل ایک بار پھر دستوری فیصلوں کے خلاف چل پڑا ہے۔ قوم کی تمناؤں اور امنگوں کے خلاف دوبارہ اِس تضاد کا زور شور سے سامنے آنا لازماً بد دلی، بے اعتمادی اور اضطراب کو بڑھائے گا۔ پھر آپ اس اضطراب کو دبانے کے لیے تشدد کے طریقے اختیار کریں گے۔ جب تشدد کی دوا سے مرض بڑھتا نظر آئے گا تو خدا نخواستہ آپ ان چھوٹے ہتھیاروں پر اُتر آئیں گے جن پر وہ طاقت نیچ ہو کر اتر آتی ہے جس کی کمر میں اقتدار کی تلوار بندھی ہو۔ پھر رائے عام کا قتل عام ہو گا اور اس کی نمائندگی کرنے والے بے گناہوں کے خون سے آپ ہاتھ رنگیں گے۔ مگر کوئی تخت جو لاشوں کے ڈھیروں اور خون کی لہروں پر بچھایا جائے، اپنے پایوں کو مضبوط نہیں بنا سکتا۔

مغربی تصورات کو مسلمان قومیں ——— ان میں سے خاص طور پر پاکستانی قوم ——— اپنے اندر جذب کرنے پر کسی طرح تیار نہیں ہیں۔ ان قوموں کی اکثریت پر اگر مغرب پرست اقلیت محض اختیارات کے زور سے مغربی تصورات کو ٹھونستی بھی ہے تو یہ اپنی جڑیں نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ تصورات چونکہ جہاں جس حد تک دخل پاتے ہیں اسلامی تصورات سے لازماً متصادم ہوتے ہیں، اس لیے مسلم قوموں میں ان کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ ترکیہ میں کمالی تحریک نے حکومت کی طاقت سے سالہا سال تک اسلامی تصورات کی بیخ کنی اور مغربی تصورات کی آبیاری کی جو کوششیں کی ہیں اُن کے بعد بھی دیکھیے تو معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ بلکہ نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ مصطفیٰ کمال کی سیاسی عزت کو بچانے کے لیے قانون کے ڈنڈے سے کام لیا جا رہا ہے۔ یہی حال مصر کا ہے کہ عوام اسلامی تصورات سے ہزار تشدد کا سامنا کرنے کے باوجود وابستہ ہیں۔ پاکستان کے عوام تو دینی احساس و شعور کے لحاظ سے اور زیادہ آگے ہیں۔ یہاں مغربی تصورات کو بالجبر ٹھونسنے سے ذہنی کشمکش و اضطراب کی ایک ایسی صورت نمودار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی جو قومی تعمیر و ترقی کے لیے سخت موجب نقصان ہو گی۔ اور آج بھی پاکستان کی ترقی میں اگر کوئی چیز مانع ہے تو وہ یہی ہے کہ قوم کی اکثریت کسی اور طرف بڑھنا چاہتی ہے اور برسرِ اقتدار طبقے کی اقلیت اسے

کسی اور طرف گھسیٹتی ہے۔

بس ہمارا مشورہ یہی ہے کہ جو دستوری فیصلے اسلام کے مطابق ہوئے ہیں ان کے خلاف فراری ذہنیت کے ساتھ ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی ہمارے ملک کے اکابر نہ کریں، جو وعدے قوم سے وہ کرتے رہے ہیں، اُن سے عمل کے میدان میں انحراف نہ کریں، جو اسلامی نعرے اور تقریریں وہ پیش کرتے ہیں اُن سے برعکس عملی مفہوم پیدا نہ کریں، کتاب وسنت کے اسلام کو قائم کرنے کا عزم ظاہر کرنے کے بعد وہ "ماڈرن اسلام" کے کرشمے نہ دکھائیں۔

قیادت کی مضبوطی، قوت اور مقبولیت کے لیے، ملک وقوم کی تعمیر وترقی کے لیے اور اسلام کو ایک ریاست کی شکل میں استوار کرنے کے لیے ایک ہی سیدھا راستہ ہے۔

اسلامی ریاست کی نیو ڈال دینے کے بعد ہمارے ملک کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہماری وہ آئیڈیالوجی ہو گئی ہے جس کا ظہور دستوری رپورٹ کے رہنما اصولوں اور اس کی قرار دادِ مقاصد سے ہوتا ہے۔ اب ہماری آزادی اور ہماری قوت اور ہماری ترقی کا دار ومدار اسی قیمتی متاع کے تحفظ پر ہے۔ اب ہمارے لیے یہی اصل سرچشمۂ حیات ہے اور اسی سے ہمارے تمام عزائم اور حوصلوں اور امنگوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ یہ آئیڈیالوجی سلامت رہے تو ہم سلامت رہیں گے، یہ اغیار کی مداخلت سے آزاد رہے تو ہم آزاد رہیں گے، یہ نشوونما پائے تو ہم نشوونما پائیں گے، یہ مضبوط ہو تو ہم مضبوط ہوں گے۔ دوسری طرف اسے کوئی وجہ کمزور کرے تو ہم کمزور ہو جائیں گے، اسے کوئی سازش ملیامیٹ کرے تو ہم ملیامیٹ ہو جائیں گے اور اسے کوئی پھلنے پھولنے کی آزادی سے محروم کرے تو ہم بھی ترقی کرنے کی آزادی سے محروم ہو جائیں گے۔

اس آئیڈیالوجی کے سرچشمۂ حیات کا تحفظ اور نشوو ارتقا ممکن ہے تو صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ دنیا کی کسی امپیریلسٹ طاقت کو سیاسی، معاشی اور نظریاتی میدان میں ہمارے اوپر اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔ ہماری آئیڈیالوجی سے اختلاف رکھنے والی اور کوئی برعکس قسم کی آئیڈیالوجی رکھنے والی قوم

اپنا پرتو اس کے اوپر نہ ڈال سکے۔ لیکن اگر کسی کو ہم اس کا موقع دے دیں تو یہ سرچشمۂ حیات زہر آلود ہو جائے گا، یہ اپنی زندگی بخش برکات سے خالی ہو جائے گا اور ہم حقیقی آزادی، ترقی اور خوشحالی سے کبھی ہمکنار نہ ہو سکیں گے جو اسلامی اصولوں کے نتیجے میں ہمیں ملنی چاہییے۔

اسلامی ریاست اپنی برکات کے ساتھ اسی صورت میں پروان چڑھ سکتی ہے جبکہ وہ اپنی داخلہ و خارجہ پالیسی کو نئی اٹھان اٹھانے کے لیے ہر قسم کی مداخلتوں سے آزاد ہو۔ وہ اپنے سیاسی و معاشی مسائل کو خود حل کر سکے، وہ اپنے بھلے اور برے کا خود فیصلہ کر سکے، وہ اپنے باشندوں کے لیے خیر و شر کو خود متعین کر سکے، وہ صلح و جنگ کے بین الاقوامی معاملات کو اپنی مرضی سے طے کر سکے۔ لیکن اگر اسے پیدا ہوتے ہی کسی ایسے معاہدے یا بین الاقوامی معاملے میں جکڑ دیا جائے کہ اس کی آزادانہ نشوونما میں رکاوٹیں حائل ہو جائیں تو کاغذ پر لکھا ہوا اسلامی دستور کوئی کرامت نہیں دکھا سکتا۔ اس دستور اور اس کے مقاصد کے تحفظ کا اگر اوّل روز ہی سے اہتمام نہ کیا جائے تو حالات اس کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔

آج اگر ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی امداد کی احتیاج کے تحت لاپروائی سے ایسے معاملات کر رہے ہیں جو کل جب اپنے پورے برگ و بار لائیں گے تو ہمیں بعد از وقت یہ محسوس ہو گا کہ:۔

—— ہم مستقبل کی جنگ کے ایک فریق کے ساتھی بن گئے ہیں جس میں ہماری آئیڈیالوجی اور ہماری مصلحت ہماری شرکت کے حق میں نہیں جا رہی ہے، اور عین وقت پر اندازہ ہو کہ تیر کمان سے نکل چکا۔

—— ہماری منڈیوں پر، بلکہ ہمارے پیدا آوری نظام پر وہ طاقت اثر انداز ہونے لگی ہے جس کے کسی احسان اور جس کی کسی امداد کے ہم منت کش ہوئے تھے۔

—— ہمارے کلچر اور ہماری معاشرت کو خود ہمارے نمائندوں کے ہاتھوں اور خود ہمارے قومی اداروں کے ذریعے ہمارا کوئی "محسن" ملک ملیامیٹ کر رہا ہے اور ایک نامطلوب کلچر اور معاشرت کو ہمارے اوپر مسلط کر رہا ہے۔

—— ہمارے داخلی سیاسی عناصر اور رجحانات میں سے کسی کو ابھارنے اور کسی کو دبانے کے لیے ملک کی رائے عام اور قانون اور مفادِ ملک کے بجائے پس پردہ کسی اور کی رضا فیصلہ کن بن گئی ہے۔

آخر امپیریلیسٹ طاقتوں کے طریقِ کار کی ایک مستقل تاریخ ہے اور ان کی کرم فرمائیوں اور عنایات اور ان کے احسانات کے پیچھے کام کرنے والے منصوبوں نے دیس دیس میں جو گل کھلائے ہیں ان کے رنگ و بو سے ایک دنیا واقف ہے۔ "عنایات" ہوتی ہیں مگر کہیں بھی "فی سبیل اللہ" نہیں ہوتیں، ہر عنایت سوداگرانہ ذہن کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ایک ہاتھ سے جو کچھ دیا جاتا ہے، دوسرے ہاتھ سے اس سے زیادہ لیا جاتا ہے۔ آخر جو ملک آپ کو غلہ یا روپیہ یا اسلحہ دیتا ہے تو وہ جواب میں آپ سے کچھ لیگا بھی! سوال یہ ہے کہ اس کی نظر کس مفاد پر ہے؟

آپ کہتے ہیں کہ ہم لینے کو تو سب کچھ لے لیں گے، دیں گے کچھ نہیں! فی الواقع اگر ایسی گانٹھ کی پوری اور عقل کی کوری کوئی قوم آپ کے علم میں آگئی ہو تو یہ دریافت بڑی یادگارِ زمانہ ہوگی — ورنہ اندیشہ جس دوسری صورت کا ہے وہ یہ ہے کہ بھوکے پکھیرو کو دانۂ صیاد نظر آجاتا ہے لیکن دامِ ہمرنگِ زمیں نظر نہیں آیا کرتا۔ آپ اگر دانہ بھی کھالیں اور دام سے بھی بچ نکلیں تو تاریخِ انسانی میں یہ پہلا معجزہ ہوگا۔

امپیریلسٹ قوتیں جن ممالک میں بھی اپنا میدانِ تگ و تاز بناتی ہیں وہاں کسی ایسے اصول، نظریئے تحریک اور سیاسی نظام کے لیے پنپنے کی فضا نہیں بننے دیتیں جو ان کے مفاد میں حائل ہو سکے۔ وہ کسی زیرِ اثر آئے ہوئے معاشرہ کو کبھی ایسی بنیادوں پر تعمیر ہونے نہیں دیتیں جو ان کے مقاصد کے لیے ساز گار نہ ہوں۔ ایسی طاقتوں سے جتنا خطرہ کسی قوم کی سیاسی اور معاشی آزادی کو ہو سکتا ہے اس سے زیادہ شدید خطرہ اس کی آئیڈیالوجی کی آزادی کو ہوتا ہے۔

پس ہمہ گیر تبدیلی کا منصوبہ پیش کرنے والا اصولی دستور بنا کر نئی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے ایک قوم کو غیر ملکی طاقتوں سے معاملات اور معاہدات کرتے ہوئے انتہائی محتاط ہونا چاہیے۔ لیکن ہمارے سربراہ کار ایک طرف اسلامی دستور بناتے ہیں اور دوسری طرف بین الاقوامی معاملات طے کرنے میں نہ صرف لاپروائی سے کام لیتے ہیں، بلکہ ان کے قول و فعل کے تضاد کی وجہ سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس دستور کی روح اور اس کے مقاصد کی تباہی کے امکانات سے واقف ہوتے ہوئے وہ دانستہ اس طرح کے فیصلے نہ کر رہے ہوں۔ دونوں میں سے جو بھی صورت ہو، افسوسناک ہے

(باقی صفحہ ۷۸)

ترکی اور اس کی موجودہ اسلامی تحریکیں

(از جناب سعید رمضان صاحب ایڈیٹر "المسلمون" قاہرہ) اداره

عام حالات ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رُو سے ترکی کی آبادی ۲ کروڑ سے زائد ہے۔ اس آبادی کی عظیم اکثریت ترکوں پر مشتمل ہے۔ اور ترک سارے کے سارے مسلمان ہیں۔

اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے ترکی کو نہایت اہم اور ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ اس میں چاروں موسم بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ اس کا بڑا حصہ سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ جس طرح جسم میں شریانیں پھیلی ہوئی ہیں اسی طرح اس کے تمام اندرونی حصہ میں دریا رواں ہیں۔ پانی کی بڑی بہتات ہے۔

ترکی قوم کی فطرت اسلامی ہے۔ اس کے تمام افراد مسلمان ہیں، یہاں تک کہ لفظ "ترک" خود مسلمان کا ہم معنی بن گیا ہے اور وہاں جو مسلمان نہیں ہے وہ ترک نہیں ہے۔ اس صورت حال پر کسی کو تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ قوم زندگی و تمدن اور عزت و شرف سے متعارف ہی اسلام کے ذریعہ سے ہوئی ہے۔

سابق تاریخ تیس سال پہلے تک دولتِ عثمانیہ اس دنیا کے ایک بڑے حصے پر پھیلی ہوئی تھی۔ عثمان نے اس کی بنیاد رکھی اور محمد فاتح نے اسلام کی مضبوط بنیادوں پر اسے ایک عظیم الشان سلطنت بنا دیا۔ دولتِ عثمانیہ کے تخت پر بہت سے صالح، جفاکش اور دیانتدار حکمراں بیٹھے جن کی اَن تھک کوششوں سے اس حکومت کو سابق اسلامی حکومتوں کی سی عظمت حاصل ہوئی اور مسلمان اس کے زیرِ سایہ بغیر کسی تفریقِ رنگ و خون کے اس اسلامی عدل سے متمتع ہوتے رہے جو اسلام کا مخصوص ورثہ ہے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ اس میں بھی ولی عہدی کے رواج نے راہ پالی، حالانکہ اس چیز کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ اس کے بعد خلفا سلطنت کی بہبود اور ترقی کی فکروں کو چھوڑ کر اپنے عیش و تنعم کے پیچھے پڑ گئے۔ جس کا نتیجہ ایک عام انحطاط اور زوال کی شکل میں نمایاں ہونا شروع ہوا۔ اس کمزوری سے

فائدہ اٹھا کر مغربی قومیں دولت عثمانیہ پر چڑھ دوڑیں اور یہ سلطنت ان کمزوریوں کے سبب سے جو اس کے اندر پیدا ہو چکی تھیں ان مغربی قوموں کے اقدامات کا توڑ نہ کر سکی۔ بالآخر سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے، اس کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور مخالف قوتوں نے اس کے خلاف نہایت مضبوط جتھہ بندی کر لی۔ صیہونی یہودیوں نے اس کے قلب، فلسطین کو تاکا اور سلطان عبدالحمید سے مطالبہ شروع کر دیا کہ وہ اس حصے کو ان کے حوالے کر دے۔ وہ انکار کرتا رہا اور وہ اس کے لیے برابر سازشوں میں لگے رہے۔ روسیوں نے اپنی سرحدوں سے ملحق علاقوں کو دبا لینے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ انگریز اور فرانسیسی زیادہ ہوشیار اور حوصلہ مند تھے، انہوں نے یہودیوں کے ساتھ مل کر اس بات کے لیے سازشیں شروع کر دیں کہ بغیر کسی جنگ اور خونریزی کے اس عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ "فری میسن" تحریک اور صیہونی انجمنوں نے ہر طرف اپنے جال بچھا دیئے اور مسلمان ان کے ہاتھوں میں آلۂ کار بن کر خود اپنی تباہی کے سامان کرنے لگے۔

بالآخر ہر چیز کو "ترکیانے" کی تحریک وجود میں آئی اور ساری دولتِ عثمانیہ کو خالص ترکی قومیت کے رنگ میں رنگ دینے کا غلغلہ بلند ہوا۔ "انجمن اتحاد و ترقی" نے مملکت کی مسلمان رعایا کے اُن طبقات کو بھی اس قومیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جو ترکی نسل سے تعلق نہ رکھتے تھے اور جو اسلام کے سوا کسی اور رنگ میں رنگے جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنی سابق یک جہتی کھو کر متصادم گروہوں کے اندر بٹ گئے اور اسلام کے دشمنوں کے لیے یہ بہت سہل ہو گیا کہ وہ ان کو ستا شکار دیکھ کر آسانی کے ساتھ ہڑپ کر جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ترکی کو آپس میں تقسیم کر لیا۔

موجودہ ترکی آج کا ترکی ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔ اب وہ مغربی قوموں کے لیے خوانِ یغما نہیں رہا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تبدیلی کا راز کیا ہے؟ لیکن اس سوال کے جواب سے پہلے اگر ایک شخص ترکی کے موجودہ مرکزی شہروں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالے اور وہاں زندگی کی رفتار کا جائزہ لے تو اس پر یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ آج کا ترکی فی الحقیقت ہر پہلو سے

آزاد اور خود مختار نہیں ہے اور نہ وہ ہر پہلو سے ترقی کی طرف جا رہا ہے۔ بلکہ بہت سے پہلوؤں سے وہ بڑی تیزی کے ساتھ انحطاط کی طرف جا رہا ہے۔ ان شہروں کی ہر چیز ــــ مساجد اور گنتی کے کچھ اللہ کے مخصوص بندوں کے سوا ــــ اس بات کی گواہی دے گی کہ ترکی اسلام سے بہت دُور ہو چکا ہے۔ اخلاق تباہ ہو رہا ہے، ذہن پراگندہ ہو رہے ہیں اور الحاد کا دَور دورہ ہے۔ ایک لا دینی حکومت زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے اہل کتاب اور مشرکین سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ تقریبًا پوری قوم اسلام کی حقیقت سے بے خبر بنا دی گئی ہے۔ اخلاقی اور ذہنی خرابیوں کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور جسمانی امراض بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ ترکی میں ایسے بے بنیاد نظریات پرورش پا رہے ہیں جو ایک بڑے خوفناک مستقبل کی خبر دے رہے ہیں۔

انہی فتنوں کے درمیان اناطولیہ کا وہ مجاہد ترک بھی بستا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک مجاہد اور غیور مسلمان ہے۔ ان کے اندر بلاشبہ ایسے افراد ہیں جو اپنے عہد ایمان پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں۔ اور جن کے اندر اسلامی شجاعت اور اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ اب بھی بھڑک رہا ہے۔ آتا ترک کے لائے ہوئے انقلاب نے دینی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے ان پر جو آفتیں ڈھائیں اس کے اثر سے یہ اندر اندر برابر گھل رہے ہیں۔ ان کے اندر مسلمان افراد بھی ہیں اور مسلمان گھرانے بھی ہیں اور درحقیقت ترکی کی قوت کا سرچشمہ یہی لوگ ہیں۔ اناطولیہ کے یہی مجاہد تھے جو ہمیشہ اس حکومت کے پشت پناہ رہے ہیں اور دشمنوں کے تمام حملوں کا پوری بے جگری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ تیس سال پہلے جب دشمنوں نے ترکی کے حصے بخرے کر ڈالے تھے تو آتا ترک نے انہی لوگوں کے اندر پناہ لی اور پناہ لینے کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کو دشمنوں سے جہاد کرنے پر ابھارے آتا ترک نے ان لوگوں کی اسلامی غیرت اور مومنانہ ہمت کو اُبھارا اور ان پر اثر ڈالنے کے لیے ان کے سامنے اپنے آپ کو ہمیشہ ایک ایسے مذہبی اور خدا ترس مسلمان کی صورت میں پیش کیا جو روزے، نماز، اور تمام احکام شرعی کا پورا پابند ہے۔ اس چیز سے متاثر ہو کر اس دینداد گروہ نے آتا ترک کا ساتھ دینے کے لیے کمر ہمت باندھ لی۔ اور فوزی چقمق رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اللہ اکبر کا نعرہ

لگانے ہوئے جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اور دیکھتے دیکھتے دشمنوں کو اپنے ملک کے حدود سے باہر نکال دیا۔

جب دشمن کا قلع قمع ہوگیا اور اتاترک کا اقتدار پوری طرح جم گیا تو اتاترک نے یکایک اپنے چہرے سے دینداری کی نقاب اتار دی۔ لوزان کانفرنس میں اسلام دشمنوں نے اس کے سامنے لادینیت (سیکولرزم) کا جو نظریہ پیش کیا تھا اس کو اس نے قبول کر لیا۔ پھر یہ چیز اس کے دل و دماغ پر اس طرح حاوی ہوگئی کہ اس نے دین کے حامیوں اور اسلام کے خدمت گزاروں اور ملک اور قوم کے مخلص خادموں کی بیخ کنی کا ارادہ کر لیا۔ اسلام کے مذکورہ دشمنوں نے ظلم و فساد کی کچھ دوسری طاقتوں کے ذریعہ سے بھی اتاترک کی تائید کی اور ان لوگوں سے مل ملا کر اس مشہور انقلاب کی اسکیم بنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر وہ چیز جو اسلام سے کسی نوعیت کا بھی تعلق رکھتی ہے اس دلیل کی بنا پر ختم کر دی جائے کہ وہ پستی اور جہالت کا سبب ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے پورے ترکی کو ملحد اور بے دین بنانے کی کوشش کی اور ان ساری چیزوں کو جن کا اسلام سے تعلق تھا یا تو ان کو ختم کرنے کے درپے ہوگئے یا کم از کم ان کو مسخ کر کے چھوڑا۔ اذان ترکی بنا دی گئی، قرآن ترکی میں کر دیا گیا۔ رسم الخط لاطینی اختیار کر لیا گیا۔ ہیٹ پہننا جبری کر دیا گیا۔ مدرسوں کے نصاب تعلیم سے دین کو بالکل خارج کر دیا گیا۔ جمعہ کی چھٹی اتوار کو کر دی گئی۔ تمام قوانین اور احکام یورپ سے مستعار لیے گئے اور ان ساری چیزوں میں مغرب کی اندھی تقلید اختیار کر لی گئی۔ حتیٰ کہ نکاح اور طلاق اور وراثت تک کے متعلق مسلمانوں کے شخصی قانون تک کو بدل ڈالا گیا، اور قرآن کے صریح احکام تک کے منسوخ کرنے میں تامل نہ کیا گیا، حالانکہ مسلمانوں کے شخصی قانون میں یہ مداخلت انگریزوں اور فرانسیسیوں اور دوسری مغربی قوموں نے بھی نہ کی تھی۔

مجھے اسلامی تحریکات کے بعض کارکنوں نے یہاں تک بتایا ہے کہ اس انقلاب کے ائمہ ایک مرتبہ سر جوڑ کر اسلام اور قرآن کا آخری فیصلہ کر دینے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ ایک گروہ کی تجویز یہ تھی کہ نعوذ باللہ قرآن کو چاک کر دیا جائے، یا باہر سے اس کا منگانا یا ملک میں اس کا چھاپنا ممنوع

کر دیا جائے، تا آنکہ ہم جو انقلاب لانا چاہتے ہیں یہ پوری طرح ملک کے اندر جڑ پکڑ لے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جب تک یہ قرآن موجود رہے گا بے چینی اور بے اطمینانی کے اسباب کا خاتمہ ناممکن ہے لیکن انقلابی پارٹی کی غالب اکثریت نے یہ تجویز رد کر دی اور کافی غور و بحث کے بعد اس رائے پر سب متفق ہو گئے کہ آئندہ نسل کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے قرآن کو پارہ پارہ کر دے۔ اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ اس کو بالکل نظر انداز کیا جائے اور زندگی کے معاملات سے اس کو بالکل خارج کر دیا جائے۔

نئی اسلامی تحریکیں (۱) حزب الامت ـــــ اس پارٹی کا سنگ بنیاد اس وقت رکھا گیا جب فوزی چقمق رحمۃ اللہ علیہ پر انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ اتاترک کی بد عہدی کا راز فاش ہوا اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اتاترک اباحیت اور مخالفتِ اسلام کی راہ پر جا رہے ہیں۔ اس وقت فوزی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ عہد کیا کہ وہ اپنی پوری زندگی اپنے ملک کے اندر اسلام کو باقی رکھنے کی جدوجہد میں لگا دیں گے اس مقصد کے لیے انہوں نے "حزب الامت" کے نام سے ایک پارٹی بنائی۔ لیکن انقلابی پارٹی نے پوری قوت کے ساتھ حزب الامت کی مخالفت کی اور اس کے اندر اپنے ایسے آدمی شامل کر دیئے جو برابر اس جدوجہد میں لگے رہے کہ یہ پارٹی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

(۲) تحریکِ نورانیت اس راستے میں دوسرا قدم ایک مشہور کُردی عالم نے اٹھایا۔ انہوں نے تحریک "نورانیت" کے نام سے ایک تحریک چلائی۔ یہ نام ان قرآنی آیات سے ماخوذ تھا جو اسلام کے مقصد کو ظاہر کرتی ہیں یعنی لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکالنا۔ مثلاً یخرجھم من الظلمات الی النور۔

ان کُردی عالم کا نام سعید نوری اور لقب بدیع الزمان ہے۔ یہ ترکی کی پہلی پارلیمنٹ کے، جس کی بنیاد اتاترک نے رکھی تھی، رکن تھے۔ یہ ساری انقلابی تحریک میں اس کے آغاز سے شریک رہے تھے۔ اور ان کی وفاداری میں کبھی شبہ نہیں کیا گیا۔ لیکن جونہی یہ بات کھلی کہ وہ اس بے دین انقلاب کے مخالف ہیں، ان کو فوراً جیل میں ڈال دیا گیا اور ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے

لیکن یہ مضبوط دل گردے کے آدمی تھے۔ انہوں نے قید خانے ہی کے اندر اپنی دعوت کے اصول مرتب کیے اور جیل سے نکلتے ہی ان کی عام تبلیغ شروع کر دی۔ ان کا لٹریچر کافی وسیع ہے اور ان کی تصنیفات میں سے "دلیل الشباب" اور "عصاءِ موسیٰ" وغیرہ ان کی دعوت کے مقصد کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ میں اس دعوت کے بانی سے خود مل چکا ہوں اور انہوں نے خود اپنی دعوت میرے سامنے پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے۔ اگرچہ اس مردِ بزرگ کی عمر ۹۰ سال سے متجاوز ہو چکی ہے، تاہم اس ملک میں اسلام کو بچانے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔ پچیس سال سے یہ تحریک خاموشی کے ساتھ کام کر رہی ہے اور تقریباً ہر جگہ پہنچ چکی ہے۔ یہاں تک کہ اب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی یہ آہستہ آہستہ اپنے قدم جما رہی ہے۔

تحریکِ اسلامی اور حکومت تحریکِ نورانیت ترکوں کے اندر ایک عام اسلامی فکر اور مذہبی احساس پیدا کرنے میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ اس کا اثر پچھلے انتخابات میں نمایاں ہوا جبکہ قوم نے ریپبلکن پارٹی کو، جو اتاترک کی پارٹی تھی اور جو تقریباً چوتھائی صدی تک ملک پر حکمراں رہ چکی تھی اور جو انقلاب لانے اور دین کی مخالفت کرنے میں پوری شہرت حاصل کر چکی تھی، اقتدار سے ہٹا دیا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ عصمت انونو کی قیادت بھی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ وہ ڈیموکریٹک پارٹی برسرِ اقتدار آئی جس کے لیڈر جلال بایار ہیں۔ اس پارٹی کی کامیابی میں بہت کچھ دخل اس کے ان وعدوں کو ہے جو انتخابات سے پہلے اس نے اسلام کو ترکی میں دوبارہ سربلند کرنے کے لیے کیے تھے۔ لیکن جب اس پارٹی کو اقتدار حاصل ہو گیا تو اس نے اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے بجائے صرف رسمی باتوں سے قوم کو مطمئن کر دینا چاہا۔ مثلاً عربی میں اذان دینے کی اجازت۔ جمعہ کے روز دس منٹ کے لیے ریڈیو سے قرآن کی تلاوت، ائمہ اور خطیبوں کی تربیت کے لیے بعض مدارس قائم کرنے کی اجازت (بشرطیکہ ان کے مصارف کے ذمہ دار عام مسلمان ہوں اور نگرانی ان پر حکومت کی رہے)، اور ابتدائی مدارس میں دینیات کی شُدبُد کی تعلیم وغیرہ وغیرہ۔

اس پارٹی کی بدعہدی کے سبب سے وہ توقعات جو دینی تحریک کے خادموں کو انتخابات سے پہلے اس پارٹی سے قائم ہو گئی تھیں وہ یک قلم ختم ہو گئیں اور انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے پچھلے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ایسی جماعت کی تشکیل کریں جو اس ملک کے اندر اسلامی انقلاب پیدا کرنے کے لیے موثر کام کر سکے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر ایک جماعت "رابطۃ القومیین الاتراک" کے نام سے ظہور میں آئی۔ اس جماعت نے اس زور و شور کے ساتھ کام شروع کیا کہ ایک ہی ہفتے کے اندر اندر اس کی اسّی سے زیادہ شاخیں قائم ہو گئیں۔ پروفیسروں، ڈاکٹروں، انجینیروں، وکلا اور اخبار نویسوں کی ایک نہایت اچھی اور منتخب جماعت اس کے اندر شامل ہو گئی۔ "منکورہ" کے نام سے ان کا ایک اخبار بھی نکلنے لگا اور بڑی تیزی کے ساتھ اس کی اشاعت بڑھنے لگی۔ جب یہ جماعت زور پکڑتی نظر آئی تو ڈیموکریٹک پارٹی اور دوسری مذہب دشمن پارٹیوں نے خطرہ محسوس کیا اور انہوں نے مل کر جماعت رابطہ پر ایک کاری ضرب لگائی۔ اس کی ساری شاخیں بند کر دی گئیں۔ اس کا فنڈ ضبط کر لیا گیا۔ اس کے اخبارات بند کر دیئے گئے۔ اس کے لیڈروں کو رجعت پسندی اور انقلاب کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ اور وہ حکومت، جو کل تک اسلامی فکر کی علمبرداری کی مدعی تھی، وہ اس بیدردی کے ساتھ اسلامی فکر سے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی کہ ترکی کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ "رابطہ" کے ارکان و متعلقین کا ہر جگہ تعاقب کیا گیا یہاں تک کہ جس کے اندر ذرا بھی دینداری اور ایمان کی کوئی بو محسوس ہوئی اس کو طرح طرح کی جسمانی اور ذہنی تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا۔ پھر حکومت نے آخری وار حقیقت فوزی رحمۃ اللہ علیہ کی اس پارٹی پر کیا جس کا ہم اوپر حزب الامت کے نام سے تعارف کرا چکے ہیں۔

دو نئے قانون: اس سلسلہ کے اہم واقعات میں سے وہ دو نادر قوانین ہیں جو ترکی حکومت نے اسلامی فکر کو دبانے کے لیے پاس کیے ہیں اور جن کے خلاف ہر حلقے سے مخالفت اور احتجاج کی صدائیں اٹھی ہیں۔ ان میں سے ایک قانون کا نام "قانونِ تحفظِ اتاترک" ہے اور دوسرے کا

نام "قانونِ تحفظِ انقلاب"۔ ان دونوں قانونوں میں ان لوگوں کے لیے نہایت سخت سزائیں تجویز کی گئیں جو کسی نوعیت سے اتاترک کی تحقیر کا ارتکاب کریں یا اس پر کوئی الزام عائد کریں، یا اس کے مجسموں کو نقصان پہنچائیں، یا اس کی تصویروں کو پھاڑیں۔ اس سے مقصود اس قسم کے جوشیلے نوجوانوں کو گرفت میں لینا ہے جنہوں نے اسلامی فکر کی حمایت کے جوش میں پچھلے سال اس قسم کی بعض حرکتیں کی تھیں نیز ان لوگوں کو بھی گرفت میں لینا ہے جو اتاترک کے لائے ہوئے انقلاب کی مخالفت کریں یا جوابی انقلاب لانے کی تدبیریں کریں۔

میں جب ان دونوں قانونوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے صاف نظر آتا ہے کہ حکومت نے یہ قانون پاس کر کے اتاترک کی "ہردلعزیزی" کا سارا راز فاش کر دیا ہے۔ باہر کی دنیا اب تک اس غلط فہمی میں تھی کہ اس شخص کو ساری ترکی قوم اپنا پیشوائے اعظم مانتی اور پرستش کرتی ہے۔ مگر اس قانون نے یہ بات کھول دی کہ خود ترکی قوم کے ہاتھوں اس شخص کی عزت کو خطرہ لاحق ہے اور قانون بنا کر اس کی آبرو بچانے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اتاترک کے پرستار ترکی میں اب صرف وہی لوگ رہ گئے ہیں جو انقلابی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور خود اخلاقی بے قیدی اور الحاد کے علمبردار ہیں۔ باقی ترک عوام کے جذبات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پچھلی تحریکات میں اتاترک کے مجسمے تمام ترکی میں بکثرت مقامات پر توڑ دیئے گئے اور جہاں تک اس کی تصویروں کا تعلق ہے دو ایک تصویروں کے سوا شاید ہی کوئی تصویر پھاڑے جانے سے بچی ہو۔

دوسری حقیقت جو ان تمام واقعات سے ایک صاحب نظر پر واضح ہوتی ہے یہ ہے کہ انقلابی پارٹی کی ساری مخالفِ اسلام سرگرمیوں کے باوجود ترکی قوم ابھی تک اسلام اور ایمان سے خالی نہیں ہوئی ہے اور انقلابی پارٹی کی تیس سالہ حکومت ترکوں کو لادینیت پر جمانے میں بالکل ناکام رہی ہے۔ یہ صورتِ حال اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ ترکی قوم کے اندر دین کی جڑ نہایت گہری اور مضبوط ہے اور یہ جدوجہد جو اس کو اسلام سے ہٹانے کے لیے کی جا رہی ہے اسے اسلام سے ہٹانے کے بجائے اس کے ایمان میں اضافے کا باعث ہوگی اور یہ بے دینی اور اباحیت جو ترکی کے بڑے بڑے شہروں میں پھیل رہی ہے اور یہ انحطاط کے آثار جو بے دین گروہ کے اندر نمایاں ہو

رہے ہیں۔ یہ ساری چیزیں انشاء اللہ داعیانِ اسلام کے مقصد کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بنیں گی۔

ایک اہم ضرورت خلاصہ یہ ہے کہ ترکی میں اسلامی تحریک برابر زور پکڑ رہی ہے اور برابر اس کو نئے نئے انصار و اعوان مل رہے ہیں۔ البتہ ایک بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تحریک اس دور میں اس بات کی سخت محتاج ہے کہ اس کو صحیح سمت میں رہنمائی کرنے والے ملیں۔ قوم پرستی کا جو صور ترکی میں پھونکا گیا تھا وہ اس زور کا تھا کہ اس سے اسلامی تحریک کے بہت سے کارکن بھی متاثر ہو گئے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ ان میں سے بعض کے اندر قومیت اور اسلامیت دونوں کے نظریات بیک وقت کام کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض جوشیلے نوجوان، جو فی الحقیقت اسلام کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں، غلط فہمی کے سبب سے قومیت کے راستوں پر نکل جاتے ہیں اور اس سے ان کی اسلامیت کی شکل بسا اوقات اس قدر بگڑ جاتی ہے کہ اس کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں ان لوگوں کو صحیح اسلامی فکر سے روشناس کرانے اور اسلام اور غیر اسلام کا فرق سمجھانے کی بڑی ضرورت ہے۔

اسی طرح عملی اعتبار سے بھی بہت سی مشکلات ان کی راہ میں حائل ہیں۔ میں نے ان میں سے کتنوں کو پایا ہے جو عمل کا سچا جوش رکھتے ہیں، مگر ان کو پتہ نہیں کہ اسلامی انقلاب لانے کے لیے صحیح طریق کار کیا ہے۔ وہ دعوت کے پھیلانے میں رات دن اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں لیکن انہیں صحیح طور پر نہیں معلوم کہ ایک سچے مسلم فرد، ایک سچے مسلمان خاندان اور ایک سچی اسلامی سوسائٹی کو وجود میں لانے کے لیے انہیں کیا قدم اٹھانے چاہئیں۔

بہر حال آج کا ترکی نہایت تیزی کے ساتھ روشنی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

(المسلمون، مصر)

اسلام اور تھیا کریسی

عبد الحمید

(۲)

اس کے علاوہ ان دونوں کے اساسی تصورات بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ تھیا کریسی کی عمارت جس بنیاد پر اٹھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حکومت گناہ کا نتیجہ ہے۔ یہ نظریہ درحقیقت اُس غلط تصور کا شاخسانہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اُن کے اوّلین گناہ کی پاداش میں اس دنیا میں اُتارا۔ لہٰذا محکومیت اور وہ جبر اور ظلم جو حکومت کا لازمی جزو ہے، سب اسی ایک گناہ کی سزا ہیں۔ ریاست کے وجود میں آنے کا سبب بھی یہی ہے کہ انسان نے خدا کے احکام سے روگردانی کر کے شیطان کا کہا مانا۔ لیکن تقدیرِ الٰہی سے مفر نہیں۔ انسان کو دنیاوی زندگی ہر صورت سے بھگتنا ہے اور اس طرح اُن تمام مصائب کو بھی جھیلنا ہے جو دنیاوی زندگی کا خاصہ ہیں کیونکہ خدا کا منشا یہی ہے۔ ان سب باتوں کو جانتے ہوئے انسان کو چاہیے کہ وہ حکومت ایسے ظالمانہ ادارے کی ساری جیرہ دستیوں کو نہایت ہی خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور اس معاملہ میں وہ جس قدر صبر و ثبات کا ثبوت دے گا اسی قدر وہ آخرت میں انعام کا مستحق ٹھیرے گا۔ ریاست بڑی حد تک ڈاکوؤں کا راج ہے۔ مگر اسے انسانی سیرت اور سرشت کے عیب نے ہی جنم دیا ہے اور اس لحاظ سے اس سے سرکشی کرنا خدا کے منشا کے خلاف ہے۔ چنانچہ پروفیسر کولنز (COLLINS) اپنے ایک مشہور لیکچر بعنوان (UNITY, CATHOLIC & PAPAL) میں لکھتا ہے:۔

"حکومت ایک ایسا ادارہ ہے جس کی بنیاد انسانوں کی بجائے خدا نے رکھی ہے، لہٰذا جس قسم کی حکومت بھی ہو وہ عین منشاءِ الٰہی کے مطابق ہے۔ اور اس میں ردوبدل کا خیال بھی راہِ راست سے انحراف ہے۔"

اسلام بنیادی طور پر انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے کے تصور کو غلط قرار دیتا ہے اور اس طرح اس تخیل کی کوکھ سے جتنے باطل نظریات نے جنم لیا ہے، خواہ اُن کا تعلق سیاست و آئین سے ہو، یا علم و فلسفہ سے، سب کی نفی ہو جاتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی ندامت و انفعال پر حق تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور اب اُن کی مقدس ذات پر گناہ کا کوئی معمولی سے معمولی دھبہ بھی باقی نہ رہا۔ انہیں دنیا میں رہنے کا جو حکم دیا گیا تھا وہ اُن کے معاف کر دیئے جانے کے بعد بھی اس لیے برقرار رہا کہ علم خداوندی میں یہ بات تھی کہ آدم دنیا ہی میں رہ کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں گے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنی کتاب اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل میں حضرت آدم کے جنت سے نکالے جانے کی نہایت ہی بلیغ تفسیر پیش فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

"جنت میں آدمؑ کی زندگی دراصل انسانیت کے اس ابتدائی دور سے عبارت ہے جب کہ اس میں احساس خودی پیدا نہ ہُوا تھا اور اُس نے اپنے ارادہ اور علم کی قوت سے ماحول سے مطابقت کرنا نہ سیکھا تھا۔ اُس کا دل آرزو اور احتیاج کی خلش سے بیگانہ تھا۔ یہ واقعہ دراصل اس حقیقت کی یادگار ہے کہ کس طرح انسان نے اپنے جبلی میلانات کے دائرہ سے باہر قدم نکالا اور ایک آزاد اور با اختیار ایغو کا مالک بنا۔ اس میں آگہی، توقف، شک اور خلاف ورزی کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ آغوش فطرت میں طویل خواب کے بعد اب وہ بیدار ہُوا اور اس کو پہلی مرتبہ یہ محسوس ہُوا کہ واقعات و حوادث کے اسباب اس کی ذات میں پنہاں ہیں۔ آدم کی نافرمانی اس کے لیے ایک سبق تھی۔ اس طرح اُس نے اپنے اختیار و ارادہ کو برتنا سیکھا۔ اس لیے اُس کا قصور معاف کر دیا گیا۔ قرآن حکیم میں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ بہشت سے نکلنے کے بعد دنیا آدم کے لیے کلفت و زحمت کی جگہ بنائی گئی تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا پائے۔ یہ تصور بالکل غیر اسلامی ہے"[1]

اسی طرح عہد حاضر کے ایک عظیم اسلامی مفکر اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں اس نکتہ کی وضاحت

[1] ترجمہ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں

کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"آدم نے توبہ کی اور اللہ نے قبول کر لی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدم اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے۔ گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھو ڈالا گیا۔ نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا، نہ ان کی نسل کے دامن پر اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذاللہ! خدا کو اپنا اکلوتا بھیج کر نوعِ انسانی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھوانا پڑتا۔ برعکس اس کے اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا، بلکہ اس کے بعد انہیں نبوت سے بھی سرفراز کیا تاکہ وہ اپنی نسلِ انسانی کو سیدھا راستہ بتا کر جائیں۔ اب جو جنت سے نکلنے کا حکم پھر دہرایا گیا، تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مقتضی نہ تھا کہ آدم کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اتارا جاتا۔ زمین اُن کے لیے دارالعذاب نہ تھی، وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں اتارے گئے، بلکہ انہیں زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ جنت ان کی اصلی جائے قیام نہ تھی وہاں سے نکلنے کا حکم اُن کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اصل تجویز تو ان کو زمین پر اتارنے کی تھی۔ البتہ اس سے پہلے ان کو اُس امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا۔"

قرآن پاک کے ایک بلند پایہ مفسر علامہ ابنِ کثیرؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف میں حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل فرماتے ہیں :۔

"حضرت آدم نے کہا خدایا کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ اور مجھ میں اپنی روح نہیں پھونکی . . . کیا تیری رحمت غضب پر سبقت نہیں کر گئی ؟ کیا میری پیدائش سے پہلے یہ خطا میری تقدیر میں نہیں تھی؟[1] جواب ملا کہ ہاں یہ سب میں نے کیا ہے تو کہا

---

[1] ممکن ہے کہ اس سے کسی شخص کے ذہن میں یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ جب اُن کی تقدیر میں اسی طرح لکھا جا چکا تھا تو اُن کا اس میں کیا قصور ہوا۔ اسی مقام کی تصریح میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں :۔

"زمین یعنی اپنی جائے تقرر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے ان دونوں کو (باقی ص ۳۸۶ پر)

پھر خدایا میری توبہ قبول کر کے مجھے جنت مل سکتی ہے یا نہیں؟ جواب ملائکہ ہاں "۔

چند سطح بیں آنکھوں کے لیے عیسائیت اور اسلام کے درمیان یہ اختلاف خواہ کس قدر معمولی ہو، مگر وہ شخص جس نے کبھی بھی زندگی کی گہرائیوں میں اتر کر اس کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ اس "معمولی فرق" نے دونوں قوموں کی زندگیوں میں ایک عظیم تفاوت پیدا کر دیا ہے۔ ایک کے نزدیک اگر یہ زندگی دار العذاب ہے تو دوسرے کے نزدیک یہ خدا کا سب سے بڑا فضل اور احسان ہے جس کے ذریعہ اسے اپنے مالک حقیقی سے اپنے تعبد اور وفاداری کے ثابت کرنے کا پورا پورا موقع بہم پہنچتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیت اور اسی طرح کے دوسرے مذاہب کو ماننے والے لوگ اس حیات کو ایک بارِ گراں خیال کرتے ہوئے، اور دنیاوی تعلقات کو طوق و سلاسل سمجھتے ہوئے اس سے فرار اور گریز کی راہیں اختیار کرنے لگے۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ انسان کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ زندگی اور اس کی مادی احتیاجات ہیں اس لیے نیکی اسی میں ہے کہ جسم کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچا کر اس قفسِ عنصری کو اس قدر کمزور کر دیا جائے کہ طائرِ روح جب چاہے آزادانہ اپنے آشیانہ کی طرف پرواز کر سکے۔ زندگی کے متعلق اس نقطۂ نظر کو اختیار کر لینے کے بعد جسم اور اس کے متعلقات سے نہ صرف انسان غفلت برتنا شروع کر دیتا ہے بلکہ اس کے خلاف ایک ایسا معاندانہ جذبہ بھی پیدا کر لیتا ہے جو کسی راہ رو کو ایسے پتھر کے مقابلہ میں پیدا ہوتا ہے جس سے اس نے بار بار ٹھوکر کھائی ہو، یا ایک مہجور آشیاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۷) امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش ہو جائے اس امتحان کے لیے یہ جنت ہی کا مقام سب سے زیادہ موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنا تھا کہ تمہارے لیے تمہارے مرتبۂ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق و مناسب مقام ہے لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلے میں اگر تم اللہ کی فرمانبرداری کے راستے سے منحرف ہو جاؤ گے تو جس طرح ابتداءً اس سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح آخر میں بھی محروم ہی رہو گے۔ اپنے اس مقام لائق کی، اپنی اس فردوس گم گشتہ کی بازیافت تم صرف اسی طرح کر سکتے ہو کہ اپنے اس دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرو جو تمہیں فرمانبرداری کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے"۔

طائر کے دل میں اپنے قفس کے خلاف پیدا ہوتا ہے۔ اس طرزِ فکر نے انسانوں کو متمدن بستیوں سے نکال کر انہیں صحراؤں اور ویرانوں میں لا کر آباد کر دیا، انہوں نے زندگی اور اس کے مسائل میں دلچسپی لینے کی بجائے اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دی۔ اگر ان راہبوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی زندگی ہر قسم کی حس و حرکت سے عاری تھی اور ان کی زندگی پر موت کا دھوکا ہوتا تھا۔ تاریخ اخلاق یورپ کا مصنف پروفیسر لیکی نہایت ہی تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بحث کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"مشرکانہ تعدیوں کا مسیحی نفوس پر ایک اثر یہ بھی پڑا کہ جو شخص مذہب کے لیے جتنی زیادہ تکالیف اٹھاتا ہے اسی قدر اسے ثواب ملتا ہے۔ پس تعدیوں کے خاتمہ پر جب مظالم برداشت کرنے کا کوئی موقع نہیں رہا تو خوش اعتقاد مسیحیوں نے جنگل میں جا جا کر طرح طرح کی تکالیف اپنے لیے پیدا کیں۔ لوگوں کے تخیل کو اس طرزِ زندگی سے خاص طور پر کوشش کر کے متاثر کیا گیا۔ نئے لوگ اس میں اہتمام سے بھرتی کیے جانے لگے اور اس داخلہ میں عورتوں نے پوری سرگرمی سے کوشش شروع کی۔"[1]

دنیا کی تاریخ میں شاید اس وبائے رہبانیت سے زیادہ پُر درد، پُر اثر کوئی داستان نہیں۔ وہ اقوام جو افلاطون (PLATO) اور خسرو کے خم کدہ سے سرشار تھیں وہ بھی دنیا اور اس کے ہنگاموں سے منہ موڑ کر

---

[1] ان لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ سینٹ جیمس کا وجود قرار پایا جس کی ذات میں تمام فضائلِ انسانی جمع تھے اور جو رحمِ مادری سے مقدس و مطہر پیدا ہوا تھا اس کے اوصاف یہ تھے کہ:-

"وہ شراب مسکرات و لحم حیوانات سے محترز تھا۔ اس کے سر پر کبھی استرہ نہیں لگا وہ نہ کبھی حمام گیا اور نہ اپنے جسم میں روغن لگنے دیا۔ اس نے ہمیشہ سوتی کپڑے پہنے۔ اون کی پوشاک کبھی نہیں پہنی۔ گرجا کے اندر وہ روز تنہا جایا کرتا۔ اور گھٹنوں کے بل جھک کر خلقت کی مغفرت کی دعائیں کیا کرتا۔ اس عمل کی مزاولت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے گھٹنے اونٹ کے گھٹنوں کی طرح سخت ہو گئے۔"

(تاریخ اخلاقِ یورپ از لیکی ترجمہ از مولانا عبدالماجد دریابادی)

جنگلوں کی طرف جانے لگیں۔ ان کی ساری زندگیاں ہر قسم کے لطیف جذبات اور اچھے احساسات سے عاری ہو کر ظالمانہ خود آزاریوں کے لیے وقف ہو گئیں اور دو چار سال نہیں بلکہ پورے دو سو سال تک جسم کُشی منتہائے اخلاق سمجھی جانے لگی۔ سینٹ جروم نہایت ہی فخر سے بیان فرماتے ہیں :-

"ایک راہب صاحب نے ۳۵ سال کی زندگی صرف نانِ جویں اور خاک آلود پانی پر بسر کی تھی۔ ایک اور بزرگ مدۃ العمر ایک تنگ وتاریک غار میں رہا کرتے اور کبھی روزانہ غذا میں پانچ انجیروں سے زیادہ نہ کھایا۔ ایک تیسرے بزرگوار ان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے۔ یہ حضرت سال بھر میں صرف ایک بار ایسٹر کے دن اپنی حجامت بنواتے تھے، نہ کبھی کپڑے دھوتے تھے اور نہ کبھی لباس بدلتے تھے، تاوقتیکہ وہ خود ہی پارہ پارہ ہو کر جسم سے علیحدہ نہ ہو جائے۔ آنکھوں کی بصارت نے شدّتِ فاقہ کشی سے جواب دے دیا تھا اور جسم کی جلد مثل پتھر کے سخت اور کھری ہو گئی تھی۔ اسی طرح سینٹ میکریس اسکندری کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سویا کرتے تاکہ اُن کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں۔ نیز یہ کہ وہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے۔ اُن کے مرید سینٹ یوسیبس اُن سے بھی بازی لے گئے تھے کہ یہ حضرت ہمیشہ تقریباً دو من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں کے اندر مقیم رہے . . . . پیلوپا ایک مشہور دوشیزہ ہوئی ہیں ان کا سن شریف ساٹھ سال تک پہنچ گیا تھا۔ اور بارہا کثافت کے باعث سخت بیمار ہوئیں۔ لیکن کبھی بجز اپنی انگلیوں کے اور کسی حصّہ جسم میں پانی نہیں لگنے دیا[1]۔"

ریاضت اور عبادت کے ایسے ظالمانہ طریقے اتنے زیادہ ہیں کہ اُنہیں ایک مستقل کتاب کے صفحات کے اندر بھی سمیٹنا ناممکن ہے۔ ان کے چند نمونے جو یہاں نقل کیے گئے اُن سے ہمارا مقصود یہ بتانا ہے کہ انسان کے پیدائشی مجرم ہونے کا تصور جو تھیا کریسی کی جان ہے انسانیت کے قافلہ کو خطرناک راہوں پر

[1] تاریخ اخلاق یورپ ۔ ترجمہ از مولانا عبدالماجد دریا بادی

لے گیا۔ اس سے نہ صرف انفرادی زندگی پامال ہوئی بلکہ معاشرتی اور سیاسی زندگی کی قدریں بھی یکسر بدل گئیں۔ اس سے اگر انسان نے ایک طرف اپنی ذاتی سیرت سے زندہ دلی، خوش طبعی، صاف گوئی، فیاضی، شجاعت اور جرأت ایسی صفات عالیہ کو خارج کر دیا تو دوسری طرف معاشرتی زندگی کی بنیادیں بھی مسمار کر دیں۔ لوگوں کے دلوں سے اپنے اعزہ اور اقارب کا احترام جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ مٹنے لگا اس کا عام ناظرین اندازہ نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کی زندگی کا منتہائے نظر یہ ہوتا تھا کہ خود انہیں نجاتِ اخروی حاصل ہو۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین و متوسلین کا اُن کی غفلت اور قساوتِ قلبی سے کیا حشر ہو رہا ہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے:۔

"ایک راہب صاحب کے پاس مدت دراز کے بعد اُن کے والدین کے خطوط دریافت کے لیے پہنچے۔ حضرت کو یہ خیال گزرا کہ کہیں اُن کے پڑھنے سے میری یکسوئی خیال میں انتشار نہ پیدا ہو، اور اُن کو بے پڑھے آگ میں جھونک دیا۔ ایک اور شخص کا قصہ مشہور ہے کہ اُسے راہب بننے کا شوق پیدا ہوا اور وہ ساری جائداد و املاک پر لات مار کے صرف اپنے ہشت سالہ بچہ کو ہمراہ لے کر خانقاہ کے دروازہ پر پہنچا۔ راہبوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن وہ ابھی اُسے اپنی جماعت میں کیونکر شریک کر سکتے تھے۔ گو وہ اپنی دولت و ثروت کو بھول چکا تھا۔ تاہم اولاد کی ممتا تو اس کے دل سے ابھی تک نہیں نکلی تھی۔ اس خیال کی بنا پر اُس کا بچہ اُس سے لے لیا گیا۔ کھانے پہننے، چلنے، پھرنے غرض ہر شے سے متعلق اُس پر ہر طرح کی سختیاں برتی جانے لگیں اور ہر طرح کی ذلتوں اور تنزلوں کا اُسے شکار بنایا جانے لگا۔ بیدرد اور اپنی نجات کا حریص، باپ روزمرہ یہ تماشہ دیکھتا لیکن کبھی مُنہ سے اُف تک نہ نکالتا تھا یہاں تک کہ ایک روز پیرِ خانقاہ کا اسے یہ حکم ملا کہ بچہ کو لے جا کر دریا میں ڈال دے[1]۔"

اس آدم بیزار اور مردم آزار اندازِ فکر سے نہ صرف معاشرتی زندگی متاثر ہوئی بلکہ قوموں کی سیاسی زندگی پر بھی اس نے نہایت ہی گھناؤنے اثرات پیدا کیے۔ راہبوں کے اس گروہ نے بے شبہ بھی حکومتوں

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ ترجمہ از مولانا عبد الماجد دریا بادی۔

کے خلاف براہ راست بغاوت نہیں کی تاہم وہ ہمیشہ لوگوں کو حکومت کی جانب سے برگشتہ یا کم از کم بے تعلق بناتے رہے اور علانیہ کہتے رہے کہ انہیں نظامِ حکومت، اور اسی قسم کی دنیاوی باتوں سے قطعًا کوئی سروکار نہیں کیونکہ حقیقی ترقی صرف اسی میں ہے کہ انسان اپنی جان پر زیادہ سے زیادہ جبر سہنے کی قوت پیدا کرے ظاہر بات ہے کہ ان تصورات سے کسی تمدن کی تخریب تو کی جاسکتی ہے مگر ان سے کسی تمدن کی تعمیر کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن لوگوں نے تمدنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہی، انہوں نے جب یہ دیکھا کہ رہبانیت ایک ایسا نظام پیش کرتی ہے جس کی فطرتِ انسانی متحمل نہیں ہوسکتی تو انہوں نے اس سے یکسر بغاوت کر کے تمدن کی بنیادوں کو خالص مادہ پرستانہ بنیادوں پر استوار کیا۔ اُن کی یہ روش فطرت کے عین مطابق تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیثیت دنیا میں اپنے اصول پر تمدن قائم کرنے میں آسانی سے کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن روحانیت خالصہ کے فلسفہ پر کسی محدود سے محدود رقبہ میں، چند لمحوں کے لیے بھی کوئی تمدنی زندگی ظہور میں نہیں آسکتی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ تھیاکریسی کے زیر اثر جتنے ممالک تھے اُن سب میں بہ یک وقت معصیت و آزادی اور زہد و رہبانیت کی دو متقابل تحریکیں دوش بدوش چلنے لگیں۔ صحراؤں اور ویرانوں میں تو زہد و تقویٰ گوشہ نشین تھے اور شہروں میں فسق و فجور کی گرم بازاری تھی۔

یہ تو ہے تھیاکریسی کے نقشہ کے مطابق کسی قوم کی معاشرتی زندگی۔ سیاسی زندگی اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور گھناؤنی ہے۔ برسرِ اقتدار طبقوں نے جب یہ دیکھا کہ ملک کے عوام تو راہبانہ شغل و ذکر اور زاہدانہ تعبد و استہلاک میں اس بُری طرح مشغول ہیں کہ انہیں نہ تو اپنے حقوق و فرائض کا ہوش ہے اور نہ ہی اپنے ابنائے جنس کا تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے لیے عیش و آرام کے زیادہ سے زیادہ وسائل جمع کرنے شروع کیے۔ قیصر کا وہ حصہ جو انہیں بغیر کسی کوشش اور جدوجہد کے خود بخود میسر آچکا تھا۔ اُن کو مطمئن نہ کرسکا اور قوت و طاقت کے اس اندھے جوش میں انہوں نے ایک "اَن دیکھے" خدا کے حصہ کو ہتھیا لینے کا عزم کیا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ راستے کی ساری رکاوٹوں کو ختم کر چکنے کے بعد انہوں نے من مانی کارروائیاں شروع کیں۔ زندگی کے ہر میدان میں نا انصافی، زبردستی، خونریزی

وہ دغابازی کا بازار گرم تھا مگر کسی "متقی" کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ ظالم حاکموں کے ستائے ہوئے لوگوں کی فریاد آسمانوں تک پہنچ رہی تھی مگر کوئی زاہد اِن سے متاثر نہ ہوتا عوام ہلاکت اور بربادی کے جنگل میں نہایت بُری طرح گرفتار تھے مگر کوئی "پارسا" ٹس سے مس نہ ہوتا۔ ان کی ساری دلچسپیاں "گلیم خویش" کو بچانے تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ دنیا اور اس سے متعلقہ امور سارے کے سارے نہایت ہی بددیانت اور ذلیل قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ جس طرح چاہتے ان معاملات کو طے کرتے اور کوئی ان پر گرفت کرنے والا نہ ہوتا۔

ان لوگوں میں شاید سب سے زیادہ مضحکہ خیز پوزیشن اُن فرمانرواؤں کی تھی جنہیں بعض وجوہ کی بنا پر روحانیت اور مادیت کے درمیان پیوند لگانا پڑا۔ یہ لوگ اپنی عبادت گاہوں میں تو پورے روحانی تھے لیکن بساطِ سیاست پر خالص مادی اور حسّی تھے۔ اشوک جو ایک عقیدت مند اور پُرجوش بدھ تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایک زبردست فرمانروا اور کامیاب فاتح تھا اس طرزِ عمل کا ایک نمونہ ہے۔ قسطنطین نے جب مسیحیت قبول کی تو اُس نے بھی یہی دو عملی اختیار کی اور مسیحیت کی روحانیت کے ساتھ بُت پرست روم کی مادیت اور جاہلیت کو جمع کیا۔ مگر یہ دو عملی زیادہ دیر تک کامیابی کے ساتھ چل نہ سکی۔ ان حکمرانوں کو روحانیت کو ترک کر کے مادیت کے مسلک کو اختیار کرنا پڑا۔

پچھلی گذارشات پر غور کرنے کے بعد معلوم ہو گا کہ تھیاکریسی کے فلسفۂ زندگی نے حیاتِ انسانی میں جو نتائج پیدا کیے وہ یہ ہیں :۔

- انسان کو پیدائشی مجرم گردانتے ہوئے اُسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ جابرانہ سے جابرانہ سیاسی نظام کا بھی خیر مقدم کرے کیونکہ اُس کی نجات اسی ظلم کو برداشت کرنے میں ہے۔
- زندگی اور اس کے مسائل سے فرار کو تقویٰ اور پرہیزگاری تصور کیا جانے لگا۔
- انسانی زندگی میں دو مختلف بلکہ متضاد تحریکیں چلنے لگیں جنہوں نے زندگی کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔

تاریخ اخلاقِ یورپ کا مصنف لیکی جس خوبی کے ساتھ اس صورتِ حالات کا نقشہ کھینچتا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے پیش کیا جائے، وہ کہتا ہے :۔

"اخلاقی قوت یوں خواہ اس وقت کے مشرکوں کے زمانہ سے زائد ہو مگر جو کچھ تھی سب صحرا کی طرف منتقل ہو گئی تھی اور اس لیے دنیا میں اُس کا کوئی خاص اثر باقی نہیں رہا تھا۔۔۔ جرأت و دلیری اور وطن پرستی کا نام و نشان بھی نہیں رہ گیا تھا اور خلقت میں رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی۔ دربار کی عیش پرستیاں، ارکانِ دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھیں۔ دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زاہد و راہبین پیدا ہوئے تھے، وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی و بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی۔ غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے۔ رائے جمہور اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی و رسوائی کا مطلق خوف نہیں رہا تھا۔ البتہ ضمیر کا مذہب کو دھڑکا ہو سکتا تھا۔ لیکن اُسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ سے سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مکاری، دغابازی، دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی۔[1]

آئیے اب ہم اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلام کلیسا کی نسبی کے برعکس، اس کائنات اور انسان کے ساتھ اس کے تعلق اور رابطہ کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔

اسلام جیسا کہ میں نے پہلے گذارش کی ہے انسان کے پیدائشی مجرم ہونے کے تصور کو سراسر باطل سمجھتا ہے اور فطرتِ انسانی کو فطرتِ الٰہی کے مطابق ٹھہراتا ہے[2]۔ (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا) کلیسا کی نسبی

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ ترجمہ از مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ ص ۱۲۳

[2] اسی خیال کی تائید میں پروفیسر لکی لکھتا ہے:-

"علماء مسیحیت کے ذہن میں انسان کے پُر معاصی ہونے کا تخیل بہت مبالغہ کے ساتھ سما گیا اور وہ معصیت کو انسان کی اصل سرشت سمجھنے لگے۔ اُنھوں نے اپنے نزدیک یہ سمجھ لیا کہ ہر انسان فطرتاً بدی کی طرف مائل ہے۔ اور نیکی کی تحریک اُس کے دل میں خاص اہتمام و کوشش کے بعد ہی

(باقی ص ۴۳ پر)

انسان کو جس قدر ذلیل اور رذیل خیال کرتی ہے، اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق وہ اتنا ہی سربلند ہے چنانچہ قرآن حکیم میں انسان کی عظمت اور سربلندی کے متعلق بلشمار آیات ملتی ہیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (۱۷: ۷۰)

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ

اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے لیے مطیع بنا دیا ہے۔

٭ اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لیے سردی سے حفاظت کا سامان ہے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) پیدا ہونا ممکن ہے۔ حالانکہ یہ تخیل واقعات کے صریحاً خلاف ہے۔ ہم اپنے گرد و پیش کیا کیفیت پاتے ہیں؟ عموماً ہر شخص ہمدردی و انسانیت کو پسند، اور بے رحمی و شقاوت کو ناپسند کرتا ہے۔ خود غرضی، شہرت پرستی، رشک و حسد کو کوئی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ دوسرے کے ساتھ بھلائی، اخوت و خدا ترسی کو سب پسند کرتے ہیں، منت پذیری و احسان شناسی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں اور احسان فراموشی کی خال خال۔ یہ وہ حالت ہے جو ہم اپنے مشاہدہ میں برابر ہر وقت پاتے رہتے ہیں۔ یہ انسان کی عام و طبعی حالت ہے، اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ شاذ و غیر طبعی ہے۔ گویا یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر سرشت انسانی کا سیدھا اور عام راستہ نیکی کا ہے اور اس میں افراط و تفریط کا نام معصیت ہے۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ نفس بشری کی معصیت پرستی کا یہ مبالغہ آمیز تخیل ابتدا کی دو تین صدیوں تک نہیں پیدا ہوا تھا۔ یہ زیادہ تر تیسری صدی عیسوی سے پھیلا۔ ورنہ شروع شروع میں تو ائمہ مسیحیت بھی گناہ کو انسان کی ایک غیر طبعی حالت سمجھتے تھے اور اسی بنا پر اس کو روکنے کی طرح طرح کی تدابیر اختیار کرتے تھے۔" (تاریخ اخلاق یورپ ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی)

منفعتیں ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ ان میں تمہارے لیے شان جمال ہے جب کہ تم صبح ان کو لے جاتے ہو اور شام کو واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر جانکاہی کے نہیں جا سکتے۔ تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ گھوڑے اور خچر اور گدھے تمہاری سواری کے لیے ہیں اور سامان زینت ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے ..... وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا۔ اس میں سے کچھ تمہارے پینے کے لیے اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کا چارہ حاصل کرتے ہو۔ اس پانی سے خدا تمہارے لیے کھیتی اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے پھل اگاتا ہے، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اسی نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخر کیے ہیں۔ یہ سب اسی خدا کے حکم سے مسخر ہیں۔ ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور بہت سی وہ مختلف الالوان چیزیں جو اس نے زمین میں تمہارے لیے پیدا کی ہیں۔ ان میں سبق حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی) نکال کر کھاؤ، اور زینت کے سامان (موتی وغیرہ) نکالو جن کو تم پہنتے ہو اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ سمندر کو اس لیے بھی مسخر کیا ہے کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجا لاؤ۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے کہ زمین تم کو لے کر لڑھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیے کہ تم منزل مقصود کی راہ پاؤ۔ بہت سی علامات بنائیں منجملہ ان کے تارے بھی ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں ... اور اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو بے حساب پاؤ گے۔

(۱۶ : ۱-۲)

ان آیات میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا کی ساری چیزوں سے ارفع اور اعلیٰ ہے اور یہ سب

اُسی کے فائدہ اور آرام کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ وہ ان سب پر فوقیت رکھتا ہے اور اسے ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔

پھر اس انسان کو نہ صرف جانوروں اور دوسری حقیر چیزوں پر فضیلت حاصل ہے بلکہ بارگاہِ خداوندی کی سب سے مقرب مخلوق یعنی فرشتوں کو بھی اس کے سامنے جھک جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ قرآن حکیم نے انسان کی اس عظمت کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے :۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۔ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۗ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝

اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا زمین میں اس کو نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کریگا۔ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے اسماء سکھا دیئے۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا تم اگر سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ۔ انہوں نے کہا پاک ذات ہے تیری، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا اے آدم ان فرشتوں کو انکے نام بتاؤ، پس جب آدم نے اُن کو ان اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو

(البقرہ: ۲۹-۳۳)

اور چھپاتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں ؟ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، اور ان سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا۔

اسی طرح سورۃ الحجر کے تیسرے رکوع میں فرمایا:۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۔ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۔ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ

اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں پھر جب میں اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے لیے سر بسجود گر جانا، چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا ابلیس تجھے کیا ہو گیا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوتا۔ ابلیس نے کہا کہ میں ایسا نہیں ہوں کہ اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے بنایا ہے۔ خدا نے کہا تو جنت سے نکل جا کہ تو راندۂ درگاہ ہے اور یوم جزا تک تجھ پر پھٹکار ہے۔

اس مضمون کو قرآن پاک میں مختلف طریقوں سے دہرایا گیا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک انسان کی عظمت، بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں خدا کا فرمانبردار ہو، فرشتوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ خداوند تعالیٰ نے مٹی کے اس پتلے کو نوری مخلوق سے زیادہ علم عطا کیا، اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی، انہیں حکم دیا کہ میرے اس نائب کو سجدہ کرو۔ چنانچہ فرمان خداوندی کے تحت سب کے سب بجز ابلیس کے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ یہ اس حقیقت کی شہادت ہے

کہ ملکوتیت بھی انسان کے سامنے عاجز ہے۔ انسان اپنی خلقت کے لحاظ سے تو بلاشبہ مٹی کا ایک حقیر پتلا ہے مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اس کو جو علم بخشا تھا اس نے اسے سربلند کیا، اور اسی بنا پر فرشتوں نے اس کی فضیلت کو تسلیم کر لیا اور اس کے آگے جھک گئے۔

مگر یہاں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ کہہ کر اس کے دل و دماغ سے اپنی خود مختاری اور اللہ کی اس سلطنت میں حکومتِ خود اختیاری کا جذبہ اور خیال، جو شر و فساد، نزاع اور تصادم کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، نکال دیا ہے۔ اسے یہ سمجھایا گیا کہ اگرچہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں اسی کے لیے پیدا کی گئی ہیں مگر ان کے استعمال میں وہ بالکل آزاد نہیں۔ اسے ان سے استفادہ کرنے میں خداوند تعالیٰ کی راہنمائی اور خوشنودی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اور اگر وہ اس طرح عمل نہیں کرتا تو وہ نائبِ خدا نہیں بلکہ باغی اور سرکش ہے اور اس لحاظ سے خدا کی امانت میں خیانت کرنے والا ہے۔ اس کی وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی عطا کردہ املاک، اس کی رعیت اس کے نوکروں، اس کے خادموں اور اس کے غلاموں پر حکومت کرنے، ان سے خدمت لینے، ان پر تصرف کرنے اور ان کی نگرانی کرنے میں اس کے بنائے ہوئے قوانین پر کاربند ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ سخت مجرم ہے، پسندیدہ نہیں مردود ہے، مستحقِ انعام نہیں مستوجبِ سزا ہے۔

پھر قرآنِ حکیم نے نہایت ہی بلیغانہ انداز میں اس کی نیابت کی اصل غرض کی بھی وضاحت فرما دی ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ۔ (۶: ۲۰)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے اونچے درجے دیے تاکہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔

قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۷: ۱۲۹)

موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تمہیں زمین کی خلافت دے تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۔

اے داؤد۔ ہم نے تجھ کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے پس تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ یہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے اس بنا پر سخت عذاب ہے کہ وہ حساب کے دن کو بھول جاتے ہیں۔

یہ آیات اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ اس کائنات میں انسان کو خلافت کا جو منصب عطا ہوا ہے وہ دراصل خداوند تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ انسان اس منصب کی نازک ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جا بجا اس کی نسبت بوضاحت ذکر ملتا ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۔

ہم نے انسان کو بہترین اندازہ پر بنایا پھر اسے سب سے نچلے درجے میں پھینک دیا سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے سو اُن کے لیے بے انتہا اجر ہے۔

یعنی انسان حقیقت میں نیک نہاد ہے اور اس کی شرافت و فضیلت مسلم ہے لیکن بُرے اعمال کی وجہ سے اس کا ازلی کمال زائل ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے نہایت بلند ۔ اس قدر بلند ہے کہ جس امانت کا بوجھ آسمان اور زمین نے اُٹھانے سے انکار کیا اُسے انسان نے جوش و وجدان میں قبول کر لیا اور اس طرح نادانستہ طور پر کائناتِ ہستی میں اپنی فضیلت ثابت کر دی۔[۵]

امام غزالیؒ اور علامہ بیضاویؒ (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت عطا کرے) نے اس آیت کی

---

[۴] آیۂ کریمہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ

[۵] اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل صـ ۹۰

تفسیر میں لکھا ہے کہ :-

"امانت سے مراد ذمہ داری اعمال کا قبول کرنا ہے، یا یُوں کہیے کہ ثواب یا عذاب کے لیے آمادگی کا اظہار کرنا جو بالترتیب اس کی اطاعت اور عصیان کا نتیجہ ہے۔ پیش کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس ذمہ داری اور ان کی استعداد کا باہم موازنہ کیا۔ انکار سے مراد طبعی انکار ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان اشیا نے اپنے اندر یہ استعداد نہ پائی کہ اس ذمہ داری کو قبول کریں۔ انسان کے اس امانت کو اُٹھانے کے یہ معنی ہیں کہ اس میں یہ استعداد موجود ہے اور اس لیے وہ اس قابل ہے کہ اس کو اپنے اعمال کا ذمہ دار گردانا جائے۔"

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ (اللہ اُن پر اپنی خاص رحمت فرمائے) اسی نکتہ کی وضاحت میں ارشاد فرماتے ہیں :-

"مَیں کہتا ہوں کہ اگر یہ معنی اور یہ تفسیر صحیح ہے (جو یقیناً صحیح ہے) تو پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے۔ انسان کی استعداد پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ ظالم اُسی کو کہتے ہیں جو عدل پر قائم رہنے کی استعداد رکھنے کے باوجود، اس سے انحراف کرتا ہے (کانٹوں میں اگر آدمی اُلجھ جائے تو کبھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ کانٹوں نے ظلم کیا۔ ان میں عدل اور ظلم کی استعداد ہی نہیں۔ جو اثر ان سے ظاہر ہوتا ہے وہ محض طبعی طور پر ان سے ظہور میں آتا ہے) اسی طرح جاہل اس کو کہتے ہیں جو علم حاصل کرنے کی استعداد رکھتا ہو اور اس کے باوجود اس دولت سے محروم رہے (چنانچہ دیوار کو جاہل نہیں کہیں گے) اب ظاہر ہے کہ انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس میں علم حاصل کرنے اور عدل کرنے کی استعداد رکھی گئی ہے؛[1]

یہی وہ اصل وجہ ہے جس کی بدولت اُسے فضیلت و عظمت عطا ہوئی۔ اور اسی سے اس میں اتنا اعتماد پیدا ہُوا کہ نہ صرف حقائق اشیا کا علم حاصل کرے بلکہ اپنی ضروریات کے مطابق فطرت میں

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔

تصرف بھی کرے[1]

ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد اس کائنات، اور اس میں خداوند تعالیٰ کی نعمتوں سے منہ موڑ کر پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان ان سے پوری طرح فائدہ تو اٹھائے مگر ان میں گم ہو کر نہ رہ جائے۔ رہبانیت میں تقویٰ کا معیار یہ ہے کہ انسان اس دنیا اور اس کے جملہ مسائل سے بے رغبتی اور بے تعلقی اختیار کر کے خداوند تعالیٰ کی رضا تلاش کرے۔ اس کے برعکس اسلام یہ کہتا ہے کہ نیکی دنیا کو ترک کر دینے میں نہیں بلکہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے خدا کی نعمتوں سے بھرپور استفادہ کرنے میں اُس کی خوشنودی کو ملحوظ خاطر رکھے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں بڑی صراحت سے کہا گیا ہے :۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ - إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۲ : ۲۱)

اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاک ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں بدی اور بے حیائی اور خدا کے بارے میں ایسی باتیں کرنے کا حکم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

---

[1] علامہ اقبال مرحوم نے اپنی کتاب بالِ جبریل میں وہ منظر بیان کیا ہے جب کہ فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کر رہے تھے۔ فرشتوں کی زبان پر انسانی فضیلت کا یہ گیت تھا :۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی

سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی

گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

يَا يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ - وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۵: ۱۲)	اے ایمان لانے والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں اُن کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان پاک اور حلال چیزوں میں سے کھاؤ جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں اور اس خدا کے غضب سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷: ۴)	کہو کہ کس نے اللہ کی اس زینت اور پاکیزہ روزی کو حرام کیا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے۔
رَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ -	اور رہبانیت کا طریقہ جو مسیح کے پیرووں نے خود نکال لیا تھا۔ وہ ان پر ہم نے لازم نہیں کیا تھا۔ ہم نے صرف رضائے الٰہی کے حصول کا حکم دیا تھا۔
لا رهبانيةَ في الاسلام	اسلام میں رہبانیت نہیں
لا صرورةَ في الاسلام	اسلام میں تجرّد نہیں

خداوند تعالیٰ کا یہ فرمان اور نبی آخرالزمان کی تصریحات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ اسلام کی نظر میں رفعتِ اخلاق یہ نہیں کہ انسان اس دنیا کو چھوڑ دے، اس کی لذتوں اور زینتوں کو اپنے اوپر حرام کر لے۔ اس کے برعکس اُسے یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ یہ دنیا انسان ہی کے لیے بنائی گئی ہے اور اس لیے اس کا فرض یہ ہے کہ اُس کو برتے اور خوب برتے۔ مگر بُرے اور بھلے، حق و ناحق کو جان کر برتے۔ خدا نے اُسے شعور اور آگہی کی جو قوتیں عطا کی ہیں، اُن سے کام لے اور اپنے عمل سے ثابت کر دے کہ وہ ترغیبات کے ہجوم میں رہتے ہوئے بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوا۔ یہ دنیا دارالعمل ہے، اور اس میں جو شخص اپنے باعمل ہونے کا ثبوت پیش نہیں کرتا وہ اپنے مقصد تخلیق کو بالکل ضائع کر دیتا ہے۔

اسلام میں بندگی صرف کسی غار میں بیٹھ کر ذکر و اذکار میں انہماک نہیں بلکہ یہاں زندگی کی کشاکش، بازاروں کے شور و شغب اور کاروبار کی مصروفیت میں رہ کر خدا کو نہ بھولنا اصل عبادت ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيتَاءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ

وہ جوانمرد جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائی سے غافل نہیں کرتی وہ اس دن سے ڈرتے ہیں، جس میں دل اور نگاہیں پلٹ جائیں گی۔

یہاں صرف خدا کی یاد اور اس کی عبادت پر اکتفا نہیں بلکہ نماز کے بعد کسب معاش، حصول رزق اور محنت و تجارت کی بھی ترغیب ہے۔ اور انہیں بھی فرائض میں شامل کیا گیا ہے

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔

جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔ اور اللہ کے فضل کی تلاش کرو۔

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ریاضت کو بھی پسند نہیں کیا جس میں انہماک انسان کو اس کے دنیاوی حقوق فراموش کرا دے۔ چنانچہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جو مسلسل روزہ رکھتے تھے اور رات رات بھر نمازیں پڑھتے تھے یہ نصیحت فرمائی :۔

فان لجسدك عليك حقا وان لعينك عليك حقا وان لزوجك عليك حقا صُم وافطر۔

تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے۔ تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔ کسی دن روزہ رکھو کسی دن نہ رکھو۔

اسلام کائنات اور زندگی کے متعلق جو مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ اس کا اثر زندگی کے ہر پہلو پر نمایاں ہے۔ تھیاکریسی نے انسانی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک خدا کا اور دوسرا قیصر کا، اور ان دونوں کا آپس میں کوئی میل نہیں۔ نیکی، راست بازی، اور صالحیت صرف خدا کے لیے ہیں۔ باقی رہے امورِ دنیا تو ان میں انسان کو پوری آزادی ہے۔ وہ جس طرح چاہے عمل کرے۔ اسی وجہ سے تھیاکریسی نے عبادت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یا تو انسانوں کا ایک مخصوص گروہ صرف پوجا پاٹ کے لیے

اپنے آپ کو وقف کر دے، یا جماعت کا ہر فرد اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کے ذکر کے لیے نکالے اور پھر سمجھ لے کہ اُس نے خدا کا حق ادا کر دیا ہے۔ اسلام اس تصورِ عبادت، اور دین اور دنیا کی اس تفریق کو سراسر باطل سمجھتا ہے۔ اُس کا انسان سے مطالبہ یہ ہے کہ اُس کی ساری زندگی، اُس کے سارے اوقات ایک خدا کی چاکری میں گزریں۔ وہ اپنے آپ کو دائمی اور ہمہ وقتی ملازم سمجھے، اور اُس کی اِس حیاتِ مستعار کا ہر لمحہ اُسی کی عبادت میں صرف ہو۔ اُس کا سونا، جاگنا، اُس کا کھانا پینا، اس کا چلنا پھرنا، غرض اُس کے سارے افکار و اعمال سب کے سب خدا کے قانونِ شرعی کے پابند ہوں۔ اُسے اپنی نجات کے لیے کسی خلوت کدے میں گوشہ نشینی، یا کسی سنسان جنگل میں چلّہ کشی کی ضرورت نہیں۔ اُس کی فلاح کا مدار اس بات پر ہے کہ وہ حیاتِ اجتماعی[1] سے بھاگ کر نہیں بلکہ اس کے منجدھار میں

[1] یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا نہایت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حیاتِ اجتماعی کی اہمیت جو کچھ اسلام میں ہے اُس سے ذہن اُس فلسفہ کی طرف منتقل نہ ہو جانا چاہیے جس کی رُو سے فرد کی انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے اُس کی ذات کو محض جماعت کی خاطر اہمیت دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اشتمالیت اور ڈکٹیٹر شپ۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس سے اتنا ہی دُور ہے جتنا کہ رہبانیت سے۔ یہاں نوعِ انسانی کا ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ قرآنِ حکیم میں مختلف مقامات پر اس کی اہمیت بتلائی گئی ہے۔ مثلاً:۔

عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵: ۱۰۵)	تم پر تمہارے اپنے نفس کی ذمہ داری ہے، اگر تم ہدایت پاؤ تو دوسرا گمراہ ہونے والا تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔
وَمَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى (۶: ۱۶۴)	ہر نفس جو کچھ کماتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے۔ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔
إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا (۱۷: ۷)	اگر تم نیک کام کرو گے تو اپنے نفس کے لیے کرو گے اور اگر بُرے کام کرو گے تو اسی کے لیے۔

اِن تصریحات کے باوجود حیاتِ اجتماعی پر جو زور دیا گیا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

رہ کر اپنے خالق سے اپنی محبت اور وفاداری کا ثبوت پیش کرے۔ اُس کی نجات کا راز فرار میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ وہ ہر قسم کے دنیاوی تعلقات میں بندھ کر، ان ذمہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لد کر خوف اور لالچ، بیم اور رجا کے ماحول میں رہ کر، اپنے پیدا کرنے والے کے منشا کو پورا کرے۔ اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا جو راستہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ خدا اس کو انسانوں کے درمیان، دنیوی زندگی کے ہنگامہ کارزار میں ملے گا۔ اور جو شخص اپنے خالق کو انسانی بستیوں میں نہیں، بلکہ جنگلوں اور ویرانوں میں تلاش کرتا ہے وہ اپنی کوششوں کو خود اپنے ہاتھ سے دریا برد کرتا ہے۔ یہاں قیصر کا کوئی حصہ نہیں بلکہ سارے کا سارا حصہ صرف خدا کا ہے اور اس میں اگر وہ کسی کو شریک کرتا ہے تو وہ شرک ایسے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے دین اور دنیا کی تفریق کو مٹا دیا ہے۔ مسلمان جب بھی دعا مانگتا ہے تو یہی کہتا ہے:۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی، اور ہم کو جہنم کی آگ سے بچا۔

سرور دو عالم نے اس حقیقت کو ایک دوسرے انداز میں اس طرح پیش فرمایا ہے۔

جُعِلَتْ لِی الارض مسجدًا

میرے لیے تمام زمین مسجد بنائی گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر سے جملہ میں حیاتِ انسانی کے اس راز کو آشکارا کیا ہے کہ یہ زندگی ایک وحدت ہے جسے کسی طور پر بھی مختلف خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ اس لحاظ سے دین اور دنیا کی تقسیم بالکل غلط ہے، اسلام کے نزدیک تمام دنیاوی اعمال خالص دینی نوعیت رکھتے ہیں۔ انسانی عمل کی کوئی شق، اخلاقی اور دینی عنصر سے خالی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے دنیاوی مسائل کو حل کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں احکام الٰہی کے مطابق حل کیا جائے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ دنیاوی اعمال ادنیٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) خداوند تعالیٰ کے سامنے انسان کی جواب دہی بڑی حد تک اجتماعی حقوق، فرائض اور ذمہ داریوں سے متعلق ہے اور انسان کے لیے اپنی انفرادی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اجتماعی ذمہ داریوں سے اچھی طرح عہدہ برا ہو۔

مقاصد کے حامل ہوتے ہیں اور اس وجہ سے نیک اور پاکباز انسانوں کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے، اسلام کے نزدیک سراسر جہالت ہے۔ یہاں ایک ہی نقطۂ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدانِ کارزار تک، طریقِ عبادت سے لے کر طرزِ معاشرت تک، اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور اہم سے اہم مسائل تک سب پر حاوی ہے۔ تھیاکریسی کی تعلیم صرف انسان اور خدا[1] کے باہمی تعلق تک محدود ہے، یہاں انسان اور انسان کے باہمی رابطہ کو ایک دنیاوی معاملہ خیال کرتے ہوئے مذہب سے بے تعلق سمجھا گیا ہے۔ اسلام اس کے برعکس جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے، اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق، انسان اور کائنات کے تعلق سے بھی بحث کرتا ہے اور نوعِ انسانی کو بتاتا ہے کہ اُسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کس نقشہ کے مطابق کرنی چاہیے کیونکہ اس کے نزدیک ان دونوں کے باہمی ربط اور ہم آہنگی سے ہی انسانی زندگی درست ہو سکتی ہے اور اسی پر اُس کی فلاح کا مدار ہے۔ اس طرح ایک دوسرے سے ان کا تعلق تکمیل و تصحیح کا ہے، تباین و تضاد کا نہیں۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح حکومت اور سیادت بھی اس کے محتاج ہیں کہ انہیں اسلام کے قوانین کے مطابق ڈھالا جائے اور اس طرح اس زمین پر ظلم و عدوان کی بجائے عدل، فتنہ و فساد کی بجائے امن، سرکشی و خونریزی کی بجائے باہمی محبت و مفاکیشی کا غلبہ ہو۔ اس لیے خدا کے پاکباز اور صالح بندوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اقتدار کی باگیں اپنے ہاتھ میں لے کر ملک و دین کی دوئی کو ختم کر کے زندگی کی فطری وحدت کو قائم و برقرار رکھیں۔ تمدن کا صحیح توازن اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جبکہ امورِ مملکت کو بھی اسی نظامِ حیات کا پابند کیا جائے جس کی پابندی کہ ایک فرد اپنی انفرادی زندگی میں کرتا ہے انسانی فطرت اجتماعی زندگی کی متقاضی ہے، انسانوں کے ذہنی اور اخلاقی قویٰ اس وقت تک نشو و نما نہیں پا سکتے جب تک عدل و انصاف کو نافذ کرنے کے لیے کوئی ایسا ادارہ موجود نہ ہو جو مفادِ کلی کی نگہداشت کر سکے۔ تھیاکریسی کے نزدیک حکومت کو انسانی سیرت و سرشت کے عیب نے جنم دیا ہے، اور اس وجہ

---

[1] سینٹ تھریسا دعا مانگا کرتی تھی کہ کاش ساری کائنات ناپید ہو جائے اور اکیلی میں موجود ہوں تاکہ آقا کی خدمت گذاری کا فخر تنہا مجھی کو حاصل ہو۔

سے اس کے ظالمانہ رویہ کو بخوشی برداشت کرنا انتہائی سعادت ہے۔ اس کے برعکس اسلام حکومت کو انعام سمجھ کر "صالحین" کے لیے اس کا حصول لازم قرار دیتا ہے، کیونکہ اسی کی مدد سے دنیا سے فساد آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے۔ یہاں استبدادیت کے سامنے سپر ڈال دینے کی بجائے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ظلم و عدوان مالک ارض و سموات کے منشا کے خلاف ہیں۔ اس لیے ایک مسلم کا یہ فرض ہے کہ انہیں جلد از جلد دنیا سے مٹانے کی سعی کرے۔ اسلام تو نام ہے اس یقین انگیز، ایمان پرور اور باطل شکن تحریک کا جس میں انسان ہر غیر الٰہی و ظالمانہ نظام کو ختم کر کے رضائے الٰہی کے مطابق ایک پُرامن نظام کی نیو ڈالتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا	کیے اُن سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو یقیناً زمین
اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	خلیفہ بنائے گا، جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ	بنایا جا چکا ہے۔ اور ضرور ان کے دین کو جسے اس نے ان
مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ وَلَا	کے لیے پسند کیا ہے مضبوطی کے ساتھ قائم کرے گا اور
يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا۔ (نور - ۷)	بالیقین ان کی حالتِ خوف کو امن سے بدل دیگا پس

وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

اسی استخلاف[1] فی الارض کے متعلق ایک اور جگہ ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے :-

[1] یہ ایک بڑا ہی نازک مقام ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ میں بیشمار غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ مذہب کو دنیوی سربلندی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اسلامی نظام کے غلبہ کی تمنا دنیوی اقتدار کی ہوس سے بالکل ایک مختلف چیز ہے اور ان دونوں کو خلط ملط کر کے ان پر ایک ہی حکم صادر کر دینا سخت غلطی ہے۔ ایک دوسرا گروہ ان الارض یرثہا عبادی الصالحون سے ایک شدید گمراہی کا شکار ہوا ہے اُس نے یہ سمجھ کر کہ زمین صالح لوگوں کی میراث ہے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ ہر وہ قوم یا گروہ جسے دنیا میں اقتدار حاصل ہے وہ صالح ہے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا مسلمان بھی

(باقی برصفحہ آئندہ)

إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۔

بیشک زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں جس کو چاہے اس کا وارث کر دے اور آخری کامیابی ڈرنے والوں کے لیے ہے۔

اسلام کے نزدیک حکومت اور مملکت اللہ کا ایک ایسا انعام ہے جس کے حاصل ہونے پر حضرت یوسف علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا سکھایا۔ اے آسمان و زمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) اس حقیقت سے واقف ہے کہ جو لوگ اپنے شخصی، یا خاندانی یا قومی اقتدار کے لیے جدوجہد کریں اور اس کے نتیجہ میں اگر انہیں اقتدار نصیب ہو جائے تو یہ وہ انعام نہیں جو دینداری کے نتیجہ میں حاصل ہوا کرتا ہے۔ بلکہ یہ خالص دنیا پرستی کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا اسباب قوت و عیش ہے جس سے کل کے نمرود، اور آج کے انگریز، امریکن اور روسی بہرہ ور ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان کو بھی صالح سمجھتا ہے تو اس سے بڑی گمراہی کیا ہو سکتی ہے۔ اس طرزِ استدلال میں جو غلطی ہے اُسے سمجھنے کے لیے فرض کیجیے کہ ایک گاؤں میں ڈاکوؤں کے حملہ کا شدید خطرہ ہے۔ اور حملہ آور ہر قسم کے اسلحہ سے پوری طرح مسلح ہیں۔ حکومت کے کارندوں نے اس دیہات کے رہنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ اگر ان کے پہرہ داروں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایماندار ہیں اور اسلحہ وغیرہ کے ملنے پر وہ اسے صحیح اور جائز طور پر استعمال کریں گے تو انہیں اپنی اور دیہات میں رہنے والوں کی حفاظت کے لیے جدید ترین اسلحہ مہیا کر دیا جائے گا تاکہ وہ ڈاکوؤں کے حملہ کی اچھی طرح روک تھام کر سکیں۔ اب اگر ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اس اسلحہ کی خواہش کرنا خود غرضی ہے اور اس کے حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی کوشش حکومت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے تو اس کی عقل پر بجز ماتم کرنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف وہ گروہ جو ہر بندوق رکھنے والے شخص کو دیکھتے ہی فوراً یہ کہہ اٹھتا ہے کہ یہ پہرہ دار ہے، اُس کے خاترالعقل ہونے میں کسی ہوشمند آدمی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۔ ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور اُن لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں ۔

یہ تصریحات اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اسلام کا نظریۂ مملکت تھیاکریسی سے بالکل مختلف ہے، ایک کے نزدیک یہ ڈاکوؤں کا راج ہے، ایک ایسی برائی جس سے ہر شخص کو نفرت کرنا چاہیے۔ دوسرے کے نزدیک یہ ایک ایسی قوت ہے جس کی مدد سے انسان کو انسانوں کے بندھن سے آزاد کیا جا سکتا ہے اور اس لحاظ سے اللہ کا بہت بڑا فضل اور احسان ۔ علامہ ابن خلدون نے اس امر کی وضاحت جس خوبی سے کی ہے، وہ اس قابل ہے کہ اُسے پیش کیا جائے ۔ وہ فرماتے ہیں :۔

" سیاست عقلیہ محض فلاح دنیا کے لیے ہے ۔ جس سے محض دنیا کی ظاہری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور بس ۔ اور شارع کا مقصود ہے اصلاح آخرت، اس لیے ضروری ہے کہ بمقتضائے شریعت عامہ خلائق دینی اور دنیاوی امور میں شریعت کے احکام کی کاربند رہے پس جو لوگ منجانب اللہ اشاعت شریعت پر مامور ہوتے ہیں اُنھیں انبیاء اور رسول کہتے ہیں اور جو ان کے بعد اُن کے قائم مقام ہو کر اُن کے قانون کی حفاظت کرتے ہیں خلفا کہلاتے ہیں ۔ اب ہمیں مملکت اور عقلی سیاست و خلافتِ نبوی کی تعریف یوں کرنی چاہیے کہ طبیعتِ مملکت عامۂ خلائق کو سلطانی اغراض اور ہوا و ہوس کے پورا کرنے پر مجبور کرتی ہے اور مملکتِ سیاسیہ حسب مقتضائے عقل دنیاوی منفعت کے حصول اور دنیاوی نقصان کے دفع کرنے کا ذریعہ ہے ۔ اور خلافت، احکام شرعیہ کے موافق ہی انسان کو اخروی و دنیاوی مصالح کے راستے پر چلاتی ہے ۔ آخرت تو اس کا مقصود بالذات ہی ہے، رہے معاملات دنیا تو وہ بھی شارع کے نزدیک تمامہا مصالح اخرویہ کی طرف راجع ہیں ۔ کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے "

قرآن حکیم نے ایک صالح سیاسی نظام کے وجود کو ہی ضروری قرار نہیں دیا بلکہ نہایت صراحت

کے ساتھ اُس کی ذمہ داریوں کو بھی گنوایا ہے۔ تھیا کریسی کو تو لازماً مستبد اور جابرہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے مظالم کے سہنے کے بعد ہی عوام کو گناہوں سے نجات حاصل ہو گی۔ اس کے برعکس اسلام نے حکومت پر فرض عائد کیا ہے کہ وہ ایک ایسا نظام قائم کرے جس سے برائیاں مٹیں اور نیکیاں پروان چڑھیں چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (الحج-۶)

جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اس آیت میں اسلامی حکومت کے مقصدِ وجود اور اس کے بنیادی فرائض کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں عوام پر ظلم کرنے کی بجائے، حکومت پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ نہ صرف خارجی خطرات اور اندرونی خلفشار کو دُور کرنے پر اکتفا کرے بلکہ ایک مثبت پروگرام کے ساتھ اُن بھلائیوں کو فروغ دینے کے لیے کوشش کرے جنہیں خدا اور اس کا رسولؐ بھلائی قرار دیتے ہیں اور اُن برائیوں کو روکے جنہیں خدا اور رسولؐ برائی کہتے ہیں۔

اس سے ایک اور حقیقت بھی کھل کر سامنے آتی ہے، تھیا کریسی اپنے مقصدِ وجود کے اعتبار سے ایک ایسا نظام پیش کرتی ہے، جس میں حکومت پر سوائے ظلم کرنے کے اور کوئی ذمہ داری عائد نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام حکومت پر کچھ ذمہ داریاں عائد کرتا ہے، جن کی بجا آوری اس کے اوّلین مقاصد میں سے ہے۔ ان میں سے سب سے بڑی ذمہ داری شہریوں کے جان، مال، آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری ہے۔ اس چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے شہریوں کے اس حق کے متعلق یوں ارشاد فرمایا:۔

ان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم ھٰذا۔

تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسی حج کے دن کی حرمت ہے۔

ان چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ الا بحقھا وحسابھم علی اللہ کی قید لگا کر اس حقیقت کو واضح فرما دیا کہ ریاست کسی شہری کی ان چیزوں میں کوئی مداخلت صرف اسلامی قانون کے اندر ہی کر سکتی ہے۔

(ب) تھیا کریسی میں برسرِ اقتدار طبقہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کے اموال سے جس قدر چاہے حصہ لے لے، اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کے خلاف کوئی بات بھی کر سکے۔ اسلام اس کے برخلاف ہر شہری کی ملکِ ذاتی کو جس کا وہ ازروئے شریعتِ اسلامی جائز طریقہ سے مالک بنا ہے، حفاظت کرتا ہے۔ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں فرماتے ہیں

ولیس للامام ان یخرج شیئا من احد الا بحق ثابت معروف	امام (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضے سے اس کی کوئی چیز نکالے۔

اگر کسی شخص کی ملکِ ذاتی پر حکومت کو کسی اجتماعی ضرورت کے لیے قبضہ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کے حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو اس کی رضامندی حاصل کی جائے یا اسے اس کا معقول معاوضہ دیا جائے[1]۔

(ج) اسلام اور تھیا کریسی میں ایک اور فرق ان کے عدالتی نظام کا اختلاف ہے۔ تھیا کریسی میں جج اقتدارِ اعلیٰ کے نائب ہونے کی حیثیت سے منزہ عن الخطا سمجھا جاتا ہے۔ اس میں دلوں کے راز جاننے اور قدرت کے اشارے سمجھنے کی قوت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ نہ تو کسی گواہ کی شہادت کا محتاج ہوتا ہے

---

[1] اس کی تائید میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے الاستیعاب جلد ۲ سے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے :-

"جنگِ حنین کے لیے جاتے ہوئے آپؐ نے صفوان بن امیہ سے زرہیں حاصل کی تھیں اور جب اس نے کہا "اَغَصْبًا یَا مُحَمَّد" کیا بلا معاوضہ لینے کا ارادہ ہے اے محمد۔ آپؐ نے فرمایا نہیں "بل عاریۃ مضمونۃ" یہ مستعار ہیں اور جو ان میں سے ضائع ہوں گی ان کا معاوضہ دیا جائے گا" (اسلامی ریاست ۔ شہریت کے حقوق و فرائض)

اور نہ ہی مجرم کی صفائی کا۔ حقیقت حال لوگوں کی آنکھوں سے خواہ کتنی ہی اوجھل کیوں نہ ہو مگر اس کے سامنے بالکل بے نقاب ہوتی ہے۔ چنانچہ ہنری چارلس لی (HENERY CHARLES LEA) اپنی کتاب (A HISTORY OF THE INQUISITION) میں لکھتا ہے :-

کسی مشتبہ گنہ گار کا فیصلہ عدالت میں آنے سے پہلے ہی ہو جاتا۔ منصف کی کوششوں کا مقصد یہ نہ تھا کہ اس بدنصیب کو ناانصافی سے بچایا جائے بلکہ یہ تھا کہ اس سے کسی نہ کسی طرح جرم منوا کر کلیسا کی لاج رکھی جائے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے صفائی کے مواقع کم کر دیے گئے۔

اس کے برعکس اسلام میں کسی شخص کی آزادی معروف قانونی طریقے پر اس کا جرم ثابت کیے بغیر اور اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر سلب نہیں کی جاسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کسی بڑے سے بڑے انسان کو بجز انبیا کے معصوم نہیں سمجھتا۔ یہاں نہ تو کوئی غیب کا علم جانتا ہے اور نہ انبیاء کے علاوہ قدرت کا راز داں۔ اس لیے ہر شخص کو پوری صفائی کا موقع دیا جاتا ہے۔ چنانچہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے بکثرت ایسی روایات ملتی ہیں جن سے لوگوں کے اس حق کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

عن بهز بن حكيم عن ابيه عن جده (اعنى جدهٔ) قام الى النبى صلى الله عليه وسلم وهو يخطب، فقال جيرانى بما اخذ ؛ فاعرض عنه مرتين، ثم ذكره ماشاء فقال النبى صلى الله عليه وسلم خلوا له جيرانهٔ

(ابوداؤد)

بہز بن حکیم اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ان کے دادا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت اس وقت خطبہ دے رہے تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ میرے پڑوسیوں کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے ؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ تو ان کے سوال کی طرف توجہ نہ فرمائی لیکن انہوں نے (سائل نے) پھر کچھ کہا تو آپ نے حکم دیا کہ ان کے

پڑوسیوں کو رہا کر دو۔

عن علی رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یا علیؓ! اذا جلس الیک الخصمان فلا تقض بینھما حتی تسمع من الآخر کما سمعت من الاول

حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی! جب تمہارے سامنے دو فریق معاملہ پیش ہوں تو ان کے درمیان اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک کہ دوسرے سے بھی اس کا بیان اسی طرح نہ سن لو جس طرح پہلے کا بیان سنا ہے۔

(باقی)

قارئین "ترجمان" کو اخبارات کے ذریعہ غالباً اس اندوہناک خبر کا علم ہو چکا ہوگا کہ ہمارے محترم اور مقتدر رفیق مولانا مسعود عالم صاحب ندوی (جن کا ایک مضمون اسی شمارے میں شامل ہے) کراچی میں سولہ اور سترہ مارچ کی درمیانی رات کو اس دارِ فانی سے رحلت کر کے رفیقِ اعلیٰ کے ہاں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔
مرحوم و مغفور کی وفات نے صرف ان کے اعزہ کو ہی ایک عظیم صدمہ نہیں پہنچایا، اور صرف جماعت اسلامی پاکستان کو ہی ایک مخلص اور قیمتی کارکن سے محروم نہیں کر دیا، بلکہ آپ کا اٹھ جانا دنیائے اسلام کے تمام علمی و دینی حلقوں کے لیے ایک بہت بڑا نقصان ہے۔
ناظرین دعاء فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی مغفرت سے نوازے اور ان کے اعزہ اور رفقاء کو صبر و ثبات عطا فرمائے، آمین! (ادارہ)

الاخوان المسلمون کا جُرم

(مولانا مسعود عالم ندوی)

[۱۳؍ جنوری سنہ ۵۴ء کو الاخوان المسلمون (مصر) خلافِ قانون قرار دے دی گئی ۱۴؍ کو ہمیں خبر ملی۔ اس وقت سے آج تک احباب کا اصرار رہا کہ میں کچھ اس پر لکھوں، لیکن معلومات کی کمی دل کھول کر لکھنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ گو یہ اعلان غیر متوقع نہ تھا اور حالات کے بارے میں جو اطلاعات اخبارات اور ڈاک سے مل رہی تھیں ان سے فوجی کونسل اور خاص کر جمال عبد الناصر کی نیتوں کے متعلق بدگمانیاں ہی بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں، تا آنکہ اس اعلان سے ان کی تصدیق ہو گئی۔

یہ پورا عرصہ حیص بیص میں گذرا۔ خیال یہ رہا کہ کچھ تسلی بخش معلومات ہوں تو لکھوں، حُسنِ اتفاق کہ پرسوں ۲۲؍ فروری کو عربی ڈاک سے کچھ ایسا مواد ملا جس نے معلومات کی کمی کے عذر کو بہت کمزور کر دیا۔ اللہ کا نام لے کر لکھنے بیٹھ گیا۔

یہ سطریں ۲۵؍ کی صبح کو لکھی جا رہی ہیں۔ حالات کے بدلتے دیر نہیں لگتی، بہت ممکن ہے کہ اس مضمون کے چھپتے چھپتے کوئی اور تبدیلی رونما ہو جائے لیکن اس مضمون کی اہمیت شاید ہی کسی واقعہ سے متاثر ہو۔ یہ بات میں خاص طور پر اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ فوجی قیادت الاخوان میں پھوٹ ڈال کر مرشد اور ان کے چند خاص رفیقوں کو تنگ کرنا چاہتی ہے لیکن انشاء اللہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو گی۔ اور اگر کسی اخوانی نے فوجی حکومت کے ساتھ تعاون کر کے اپنی تنظیم کو صدمہ پہنچانے کی کوشش کی تو وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ حالات یہی بتلاتے ہیں اور اپنا حقیر مطالعہ اس کی تائید کرتا ہے۔ م ۔ ع]

پس منظر مصر کی مشہور دینی جماعت الاخوان المسلمون سے کون واقف نہیں۔ اس کا تعارف

کرانا آفتاب کو شمع دکھانا ہے۔ یہ جماعت جو ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی، اپنے داعی کے اخلاص و جذبۂ عمل اور اپنے نصب العین کی ہمہ گیری کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے ایک عالمگیر تحریک بن گئی اور پورے عرب‌ستان میں اس کے اخلاقی و اجتماعی اثرات نمودار ہونے لگے۔ انگریزوں نے ابتدا ہی میں بھانپ لیا تھا کہ یہ ہمہ گیر اور ہر جہتی پروگرام رکھنے والی دعوت ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کے لیے پیغامِ قضا ثابت ہوگی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں بار بار اس جماعت پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ علی ماہر اور مصطفیٰ نحاس کی وزارتوں نے دورخی پالیسی سے کام لیا۔ سرکارِ برطانیہ بھی خوش رہے اور اخوان کے ماننے والے بھی آزردہ نہ ہوں۔ دعوت کے قائد اور رہنما حسن البناء مرحوم کی دوربینی اور مصلحت شناسی بھی طرح دیتی رہی۔ انہوں نے ان تمام رکاوٹوں کے باوجود پورے سکون کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔

لڑائی کے ختم ہوتے ہی مصر اور عرب‌ستان میں نئے نئے ملکی اور سیاسی مسئلے پیدا ہونا شروع ہوئے۔ الاخوان المسلمون نے بھی ایک زندہ اور فعال جماعت کی حیثیت سے ان میں حصہ لینا شروع کیا اور اپنی بے لاگ اور بے لچک دعوت کے بل پر قوم و ملک کے سامنے صحیح اور واضح پروگرام پیش کیے۔ یہ اخوان ہی کی سعیِ عمل کا کرشمہ تھا کہ مصر کی قوم پرست سرزمین میں بیس[1] سال کے بعد پھر ایک جاندار اسلامی روزنامہ جاری ہوا۔ روزنامہ الاخوان المسلمون کی پرزور تنقید اور آئے دن کی "اسرار کشائی" سے برطانوی اور فرنچ سفارت خانے تنگ آگئے۔ دوسری طرف وزیرِ اعظم مصر محمود فہمی نقراشی فلسطین کی جنگ سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ الاخوان المسلمون کے نوجوان فلسطین کی مہم میں بھی پیش پیش تھے، جس سے نقراشی کے اوسان اور بھی خطا ہو رہے تھے۔ فاروق الگ ان "نئے ملاؤں" کے بڑھتے ہوئے اثرات سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ چند غیر ملکی سفارت خانوں نے فاید (برطانوی فوج کا مصری مستقر) میں کانفرنس کی اور بالاتفاق نقراشی سے "الاخوان" کے خلافِ قانون قرار دیئے جانے کا مطالبہ کیا۔ نقراشی پریشان تھا ہی، اپنے آقاؤں کی خوشنودیِ مزاج کی خاطر اس نے "الاخوان" کو خلافِ قانون قرار دے دیا (دسمبر ۱۹۴۸ء)۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی حماقت تھی۔ پھر تو وہ افراتفری ہوئی کہ توبہ ہی بھلی! پورے مصر میں تشدد کا بازار گرم ہوگیا، اور ہزار ہا ہزار لکھے پڑھے نوجوان جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ اور ان پر اس طرح

[1] پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں اور اس سے پہلے حزبِ وطنی کے اخبار اللواء اور المؤید اسلامی مطالبات (باقی ص ۵ پر)

مظالم کے پہاڑ توڑے گئے کہ سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ خود نقراشی بھی ایک نوجوان کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے بعد ابراہیم عبدالہادی وزارت عظمیٰ کی گدی پر بیٹھا اور دین کے علمبرداروں کے ساتھ اس نے وہ سب کچھ کیا جو شاید ایک غیر مسلم بھی مشکل سے کر سکتا۔

الاخوان المسلمون خلاف قانون قرار پائی، مگر تحریک کے قائد حسن البناء مرحوم گرفتار نہیں کیے گئے۔ ان کے لیے ظالموں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا اور ایک جانے بوجھے منصوبہ کے مطابق لاکھوں مسلمانوں کے محبوب اور صداقت و حقانیت کے اس پیکر کو قاہرہ کی ایک شاہراہ پر انتہائی بے دردی کے ساتھ شہید کیا گیا (۱۲ فروری ۱۹۴۹ء) ۔۔۔ اسلام اور اسلامی تحریک کے خلاف سازش کی یہ آخری حد تھی۔

پھر حالات نے پلٹا کھایا۔ ابراہیم عبدالہادی (جس کی وزارت میں یہ خونی ڈرامہ کھیلا گیا) گدی سے اترنے پر مجبور کیا گیا۔ اور اخوان کو آزادی نصیب ہوئی۔ مگر پابندیاں قائم رہیں۔ برسر اقتدار وفد پارٹی کے وزیر داخلہ فواد سراج الدین نے لاکھ چاہا کہ اخوان سیاسیات سے کنارہ کشی کا وعدہ کریں، مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جو جماعت پورے دین کو لے کر اٹھی تھی، وہ سیاسیات سے کس طرح کنارہ کش ہو سکتی تھی؛ وفدی حکومت نے پارلیمنٹ سے قانون بھی پاس کرا دیا (۱۹۵۰ء) مگر اخوان نے اسے تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کیا، اور وہ اپنی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ آخر کار وفدی حکومت انہیں ایک قانونی پارٹی تسلیم کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس دوران میں الاخوان المسلمون کی جماعت اپنے نئے "مرشد" حسن بن اسماعیل الہضیبی کی قیادت میں اپنے مختلف شعبوں کی جدید تنظیم اور استحکام میں لگی رہی۔

جولائی ۱۹۵۲ء میں مصر کی سرزمین نے ایک اور انقلاب دیکھا۔ شاہ مصر فاروق سے قدرت نے انتقام لیا اور آن کی آن میں اس کا فرعونی جاہ و حشم داستان پارینہ بن گیا۔ فوجی افسر، جو فلسطین کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶) کی تائید کرتے تھے۔ ۱۹۱۹ء اور اس کے بعد وفد پارٹی کو عروج ہوا تو اسلامی آواز بالکل دب گئی۔ صرف ابن رافعی کا الاخبار رہ گیا تھا۔ سو وہ بھی اپنے مجاہد ایڈیٹر کی موت کے ساتھ (۱۹۲۶ء) ابدی نیند سو گیا۔ اس کے بعد تقریباً بیس برس تک مصری صحافت "بیغائیت" "بہائیت" بلا عیدیہ ہا۔ ایک محب الدین خطیب کا "مجلہ الفتح" تنہا کیا کرتا

شکست اور علی عبد الفتاح طہٰ (ایک فوجی افسر جسے فاروق کے اشاروں سے قتل کرایا گیا تھا) کی موت کے بعد ہی سے پر تول رہے تھے۔ تین دنوں کے اندر (۲۳ - ۲۶ جولائی) محیر العقول طریقوں سے حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس موقع پر اخوان نے انقلابیوں کی پوری مدد کی۔ انقلاب کے قائد اور اصلی کارکن اگرچہ نوجوان فوجی افسر تھے، لیکن ان کی کامیابی کا راز اس عام نفرت و بغض میں تلاش کرنا چاہیے جو مصریوں کے دلوں میں فاروق اور اس کے مصاحبوں کی طرف سے پیدا ہو گئی تھی۔ الاخوان المسلمون مصر کی پہلی جماعت ہے جس نے فاروق کی قصیدہ خوانی نہیں کی۔ شاہ پرستی مصر میں کس حد تک عام تھی؟ اور اس نوخیز عیاش بادشاہ کی تعریف و توصیف میں کیسے کیسے "حُر" اور "آزادی پسند" قصیدے پڑھا کرتے تھے، اُس کا اندازہ ہمارے ملک کا عام تعلیم یافتہ طبقہ کر ہی نہیں سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ شاہ پرستی کے حمام میں نحاس جیسے "حُر" اور طٰہٰ حسین جیسے آزاد خیال زندیق، اور محمد حامد فقی جیسے سنّت کے علمبردار سب کے سب ننگے نظر آتے تھے۔ ایک حسن البناء کی ذاتِ گرامی تھی جو اس گندگی سے اپنا دامن بچا کر نکل گئی۔ اور ہمارے علم میں اس آخری دور میں الدعوۃ (جس کے ایڈیٹر اور مالک اخوان کے پرانے کارکن صالح عشماوی ہیں) کے سوا کوئی اخبار نہیں تھا جس نے فاروق کی قصیدہ خوانی نہ کی ہو ——— بات کہیں سے کہیں جا رہی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ گو فوجی افسروں ہی نے انقلاب برپا کیا، مگر زمین اخوان کی دعوت ہی نے تیار کی تھی۔ اور انقلاب کے خطرناک دلوں میں بھی اخوان نے امن و امان قائم رکھنے میں فوج کی پوری پوری مدد کی، جس کا انقلابیوں نے بارہا برملا اعتراف کیا۔

اختلافات انقلاب کے بعد بھی عرصۂ دراز تک الاخوان اور انقلابی کونسل میں خاصا تعاون رہا، بلکہ اخوان کا ایک گروہ تو ان کی تائید میں اتنا آگے تھا کہ اخوان کے بہت سے خیر اندیشوں کو ان کی یہ روش بُری طرح کھٹکتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ حسن الہضیبی اور دوسرے تیز رو نوجوانوں کے درمیان اس مسئلے پر کچھ اختلاف بھی ہوا۔ لیکن یہ چیز بہت محدود دائرے میں رہی۔

اختلاف کا پہلا موقع انقلابی وزارت کی تشکیل کے وقت پیش آیا، جب کہ انقلابی کونسل کی

پیش کش اخوان کے لیے ناقابل قبول نہ ہوئی اور مکتب الارشاد (مجلس شوریٰ) کے ایک ممتاز رکن احمد حسن باقوری نے جماعت کے فیصلہ کے خلاف وزارت قبول کرلی۔ اس کو بھی اخوان والے پی گئے اور باقوری کے خلاف کوئی ملامت کی تجویز بھی نہیں پاس کی، بلکہ اخباروں میں صرف باقوری صاحب کے استعفیٰ ہی کی خبر شائع ہوئی۔ الدعوۃ باقوری کی تصویر بھی چھاپتا رہا جسے باہر اخوان کے متعارف حلقوں نے شاید کبھی پسند نہ کیا ہوگا۔ باقوری صاحب کے متعلق مزید معروضات آگے آتی ہیں۔

اختلاف کا دوسرا موقع اس وقت پیش آیا جب انقلابی کونسل نے تمام سیاسی پارٹیوں کے ختم کردینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت بھی حسن الہضیبی صاحب کی تجربہ کاری اور دوربینی کام آئی۔ ضرورت سے زیادہ پرجوش اخوانی نوجوان کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنے پر آمادہ تھے، مگر مرشد نے اپنا تشخص الگ قائم رکھنا ضروری سمجھا، خواہ اس کے نتیجے میں چھوٹی موٹی سیاسی دلچسپیوں سے کنارہ کش ہونا پڑے۔ اخوان نے حکومت کو اس سلسلے میں جو یادداشت دی تھی، اس میں صاف صاف کہا گیا تھا:

"الاخوان المسلمون ایک ہمہ گیر دینی تشکیل (ہیئت) کا نام ہے۔ 'سیاست' بھی اس کے دائرۂ عمل کا ایک حصہ ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی سطح پر ہم سے معاملہ نہیں کیا جاسکتا نیز الاخوان المسلمون ایک دینی 'ہیئت' (جامع تشکیل) ہے، عام مذہبی انجمنوں کا برتاؤ بھی اس سے نہیں ہوسکتا ہم 'سیاست' میں اس لیے دخل دیتے ہیں کہ یہ بھی 'دین' کا ایک جزو ہے" (اصل متن اس وقت موجود نہیں، البتہ مفہوم یہی تھا۔ اس کا پورا اطمینان ہے۔)

ہم نے اُس وقت بھی تسنیم میں حسن الہضیبی صاحب کے موقف کی صحت کا اظہار کیا تھا، تجربہ نے اس کی تصدیق کردی۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ اُس وقت تو انقلابی کونسل چُپ ہوگئی تھی اور آج سال ڈیڑھ سال کے بعد "انقلابی جنتا" نے اسی نام نہاد "حیلے" سے کام لے کر الاخوان کو خلاف قانون قرار دیا ہے میں اسے حیلہ ہی کہتا ہوں۔ آخر آج کونسی نئی بات پیش آگئی ہے جس سے الاخوان کو عام ملکی سیاسی پارٹیوں کی سطح پر لانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اختلاف کے یہی دو مواقع ہمارے سامنے آئے تھے، ورنہ "انقلابی جنتا" اور اس کے عقلِ کل

بکباشی (لفٹنٹ کرنل) جمال عبدالناصر کے دماغ میں فرعونیت کا جو مادہ پک رہا تھا اور پک رہا ہے، اس نے بیسیوں اختلافی مسائل نکال لیے اور آج ان سب کو ایک مفصل چارج شیٹ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس صورت میں کہ فریقِ ثانی جیلوں میں بند ہے اور مصری صحافت کے سر پر سنسر شپ کی بے رحم تلوار لٹک رہی ہے۔ ہم سنتے تھے کہ فوجی بہادر اور شیر دل ہوتے ہیں، مگر یہ کہاں کی بہادری ہے کہ ملک وملت کے بہترین افراد کو کال کوٹھریوں میں بند کر کے اُن کے خلاف بہتان طرازی کی مہم چلائی جائے اور کسی کو آہ کرنے کی بھی اجازت نہ ہو۔ عام ناظرین کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ الاخوان کو خلافِ قانون قرار دیئے جانے کی خبر تین روز تک مصری اخباروں میں شائع نہ ہو سکی، اور جب شائع ہوئی تو انہی جھوٹی اور اشتعال انگیز سرخیوں کے ساتھ جو سنسر نے اخباروں کو املاء (DICTATE) کرائیں حدیہ کہ الدعوۃ (جو برابر نکل رہا ہے) میں اب تک (۱۶ فروری کا شمارہ نظر سے گذر چکا ہے) یہ خبر شائع نہیں ہوئی ——— گویا وہ مصر سے نہیں، بلکہ مریخ اور مشتری کی خیالی دنیا سے شائع ہوتا ہے۔ غالباً صالح عشماوی کا ایمانی جذبہ جھوٹی اور اشتعال انگیز سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع کرنے پر راضی نہ ہو سکا! شاید اُن کے ہزاروں جاننے والے اُن سے یہی توقع کرتے ہونگے۔

ہم نے ابھی کہا ہے کہ جمال عبدالناصر (نائب رئیس جمہوریہ مصر) نے الاخوان المسلمون کو خلافِ قانون قرار دینے کے بعد ایک لمبی "فردِ قرار دادِ جرم" شائع کی اور کرائی ہے، جس میں انتہائی لغو، مہمل اور بے بنیاد باتیں کہی گئی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ایک بے لاگ نگاہ سے اس فردِ قرار دادِ جرم کا جائزہ لے لیا جائے۔

فردِ قرار دادِ جرم (۱) سب سے پہلے جمال عبدالناصر (کہ وہی اس چارج شیٹ کا مصنف ہے) نے ڈون کی لی ہے اور "انقلاب" کی شاندار خدمات گنائی ہیں۔ جہاں تک فاروق کے خاتمہ کا تعلق ہے، ہم اس کی خدمات کے منکر نہیں، خود الاخوان المسلمون انقلاب لانے والوں کی یکسر ہمنوا تھی لیکن راقم الحروف کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا جب "انقلابی جنتا" کے رویے میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اور اب تو اس کا عیب و ہنر سب سامنے آچکا ہے۔ اب تک انقلابی جنتا کے متعدد تاسیسی ممبر ——— رشاد مہنا، یوسف صدیق، عبدالمنعم امین، احمد شوقی وغیرہم ——— الگ کیے جا چکے ہیں۔ یہ بیچارے جیلوں میں ہیں، یا کسی

گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جنرل نجیب بھی عائب و خیل کیے جا چکے ہیں۔ بہر حال اتنا تو واقعہ ہے کہ ان دنوں ہر جگہ جمال عبدالناصر ہی کا نام آتا ہے۔ کبھی صلاح سالم اور عبداللطیف بغدادی بھی اسٹیج پر آ جاتے ہیں۔ جنرل نجیب تقریباً گم نام یا روپوش ہو چکے ہیں (یہ سطور نجیب صاحب کے استعفا کے واقعہ سے قبل کی قلمبند شدہ ہیں۔ ن ص)

(۲) دوسری چیز جس پر جمال عبدالناصر پھولے نہیں سماتے، وہ "قومی وحدت" ہے۔ مگر عملاً یہ "قومی وحدت" کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ کہیں مریخ اور زہرہ کی دنیا میں ہو، تو ہو، مصر کی وحدت تو فوجیوں کی حماقت نے پارہ پارہ کر دی۔ جو حکومت ملک کی نوّے فیصد آبادی کے دین و مذہب کو چیلنج کرے کیا وہ قومی وحدت کی علمبردار کہی جا سکتی ہے؟ سعد زغلول اور وفدیوں نے "الدین للہ والوطن للجمیع" کا نعرہ لگایا تھا۔ فوجی انقلابیوں نے شروع شروع تو صرف "ایمان باللہ" پر زور دیا، رسالت پر ایمان ان کے پروگرام سے خارج رہا۔ اب انہوں نے اخوان کے مقابلے میں ایک نیا مشرکانہ نعرہ ایجاد کر لیا ہے جو وفدیوں کے نعرہ سے بھی بدتر ہے۔ سعد زغلول نے مغالطہ سے کام لینا چاہا تھا، فوجیوں نے یہ پردہ بھی اٹھا دیا۔ اخوان کا نعرہ "اللہ اکبر وللہ الحمد" ہے۔ جمال عبدالناصر نے "اللہ اکبر والعزۃ لمصر" کی آواز اٹھائی ہے۔

(۳) فردِ جرم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ الاخوان نے انقلاب کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ سفید جھوٹ کا تصوّر مشکل ہے۔ یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ الاخوان ہی نے سب سے پہلے شاہی اقتدار کے خلاف آواز بلند کی اور اسی وجہ سے ان کے محبوب مرشد کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ یہ بھی واقعہ ہے جسے جمال عبدالناصر سے زیادہ بہتر کوئی نہیں جانتا کہ یہ اخوان ہی تھے جن کی دعوت و تبلیغ سے فوج میں حرکت پیدا ہوئی۔ خود جمال عبدالناصر ان کی دعوت سے متاثر ہوا۔ یہی نہیں بلکہ جمال عبدالناصر اور انقلابی جنتا کے کئی رکن باضابطہ اخوان کی تنظیم میں شامل ہوئے اور اخوان کی پالیسی پر کاربند ہونے کا حلفیہ عہد و پیمان کیا۔ انقلابی کونسل کے ایک رکن بکباشی انور السادات نے فوجی تحریک کی تاریخ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ جمال عبدالناصر کی اپنی ڈائری میں بھی رجوع حلمی سلام

کے قلم سے مرتب ہوئی ہے) اس کا اقرار موجود ہے۔ یہ سب مانتے ہیں کہ اخوان کے فوجی شعبہ کے انچارج صالح ابو رقیق محمود لبیب مرحوم پہلے فوجی تھے جنہوں نے فوج میں آزادی کی روح پھونکی اور اس کے لیے خفیہ جماعتیں بنائیں۔ اس سلسلے میں کہنے کی باتیں اور بھی ہیں، لیکن اجمال کا تقاضا ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جائے۔

(۴) یہ بھی الزام ہے کہ انقلاب کے بعد الاخوان نے پورا پورا تعاون نہیں کیا۔ اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ الاخوان نے اپنے آپ کو فوجی تنظیم میں مدغم نہیں کیا تو صحیح ہے۔ کوئی با اصول جماعت اس کے سوا اور کیا کر سکتی ہے۔ رہا یہ اختلاف رائے کہ زیادہ سے زیادہ زمین جو ایک شخص کے قبضے میں دی جائے وہ ۲۰۰ ایکڑ ہو یا ۵۰۰ ایکڑ، تو یہ مسئلہ کوئی اصولی اور ٹھوس مسئلہ نہیں ہے۔ ہضیبی صاحب ملکیت کی تحدید کے مخالف نہیں تھے۔ ان کی رائے اگر ۵۰۰ ایکڑ کے حق میں تھی تو یہ کوئی معصیت نہیں تھی۔ ان سطور سے غلط فہمی نہ ہو۔ ہم محض ہضیبی صاحب کے موقف کو واضح کر رہے ہیں۔ ہماری اپنی رائے ملکیت کی تحدید و تنسیخ کے باب میں ان سے کچھ مختلف ہے، جس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔

(۵) اسی طرح یہ الزام کہ وہ اسلامی قانون کے نفاذ و تطبیق کا مطالبہ کرتے تھے، حد درجہ تعجب انگیز اور افسوسناک ہے۔ ہمیں تو جمال عبدالناصر کی ڈھٹائی پر حیرت ہے۔ آخر اخوان المسلمون والے کیا کرتے؟ بے دینی کی تائید کرتے؟ بد اخلاقی کو سراہتے؟ رقص و سرود کی تعریف میں مضامین لکھتے؟ — اگر یہ مطلب ہے تو آپ سے بڑا کند ذہن کوئی نہیں۔ ایک جماعت ۲۵ سال سے اسلام کی بے میل اور پاکیزہ دعوت دے رہی ہے۔ "اقامت دین" کا مطالبہ اس کی دعوت کا سنگ بنیاد ہے۔ آخر اس مطالبہ سے وہ دستکش کس طرح ہو سکتی تھی؟

(۶) فرد جرم میں احمد حسن باقوری وزیر اوقاف کے مسئلے کو بھی چھیڑا گیا ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ باقوری کے باب میں اخوان نے بڑی نرمی برتی۔ ایسی نرمی کسی با اصول جماعت کے مزاج سے میل نہیں رکھتی۔ صالح عشماوی تو انہیں عرصہ تک اچھالتے رہے، حالانکہ باقوری صاحب اس رعایت کے مستحق نہیں تھے۔ اولاً تو انہوں نے جماعت کی وابستگی پر وزارت کو ترجیح دی، یہ خود اپنی جگہ افسوسناک ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وزارت کے بعد انہوں نے فوجیوں کی اس طرح ہاں میں ہاں ملانا شروع کی کہ

ازہر کی نگاہیں شرم سے جھک گئی ہونگی۔ باقوری صاحب ازہر کے باضابطہ عالم اور اخوان کی مجلس شوریٰ (مکتب ارشاد) کے رکن تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ مرشد کے منصب کے بھی "امیدوار" تھے۔ ان سب کے بعد ان کا یہ بیان کہ "اسلامی حکومت مسلمانوں کے لیے ضروری نہیں۔ اور قرآن مجید میں جہاں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو کافر، ظالم اور فاسق (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك هم الکافرون ... الظالمون ... الفاسقون۔ المائدہ: آیات ۴۴، ۴۵، ۴۷) کہا گیا ہے اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ مسلمانوں کے حق میں وہ آیتیں نازل ہی نہیں ہوئیں۔" پڑھ کر فرمائیے کہ "الاخوان" کو نہیں، دنیا کے کسی بھی مسلمان کو ان باقوری صاحب کے متعلق کیا رائے رکھنی چاہیے اور ان سے کیسا معاملہ کرنا چاہیے۔

رہی یہ بات کہ خود الاخوان نے وزارت کی پیش کش کیوں قبول نہ کی؟ تو اس کا جواب ظاہر ہے کوئی خوددار آدمی ایسی حکومت میں شریک ہو کر کیا کرے گا، جہاں فوجیوں کے ہاتھ میں سارا نظم ونسق ہو اور بے آئینی ہی کا نام آئین و قانون رکھ لیا گیا ہو۔ سلیمان حافظ، اسماعیل خباتی اور فواد جلال آخر کیوں مستعفی ہونے پر مجبور ہوئے؟

(۷) انہیں یہ بھی شکایت ہے کہ حسن الہضیبی انقلابی حکومت کے احکام کو چیلنج کیا کرتے تھے، حالانکہ یہ واقعہ نہیں ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ ہضیبی صاحب شروع سے اپنی جماعت کو حکومت میں مدغم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اور اس سے بعض پرجوش ارکان کو اختلاف بھی ہوا لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اُن کا مقولہ تھا:-

> "ہم حکومت کے بے لوث خیرخواہ ہیں۔ اربابِ اقتدار اچھا کام کریں گے تو ہماری تائید ہوگی اور ان سے غلطیاں ہونگی تو ہم اس پر ٹوکیں گے۔"

ظاہر ہے کہ "آمریت" نصح و نصیحت کو کب برداشت کر سکتی ہے؟ ــــ اور یہ جرم ہے تو کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اخوان اس کے مجرم تھے۔ آمریت اگر "ثواب" کا نام گناہ رکھ دے تو کوئی ان کا کیا کر لیگا؟ ان کے سامنے ہمارے ہاں کی ضرب المثل "سکھا شاہی" بھی مات ہے۔

(۸) ایک اہم الزام یہ ہے کہ الاخوان نے ان کی بنائی ہوئی سیاسی پارٹی ھیئتہ التحریر (LIBERATION RALLY) کا ساتھ نہیں دیا۔ تو یہ واقعہ ہے کہ ہضیبی صاحب نے آغاز ہی میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ الگ پارٹی نہ بنائیں۔ "انقلاب" پورے ملک اور پوری قوم کی آواز ہے۔ اسے پارٹی کا مسلک نہ بنائیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ اس پر مرشد نے کہا "بہتر! آپ پارٹی بنائیے، ہم الگ رہیں گے اور مخالفت بھی نہیں کریں گے"۔ لیکن آمریت اتنے پر کس طرح مطمئن ہو سکتی تھی؟ ان کی خواہش تھی کہ مرشد، الاخوان کو اس میں شرکت کا حکم دیں۔ یہ وہ کس طرح کر سکتے تھے! ایک خالص دینی جماعت، غیر دینی سیاسی پارٹی میں کس طرح شرکت کر سکتی تھی؟ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عام ملکی مسائل اور استعمار کی مخالفت میں بھی وہ تعاون نہیں کرتے تھے۔ وہ ان سب امور میں پیش پیش تھے۔ صرف جرم یہ تھا کہ ان کی اپنی الگ تنظیم تھی اور وہ اپنے مرشد کے احکام کے تابع تھے۔

(۹) سب سے دلچسپ الزام انگریزوں سے ساز باز کا ہے۔ اس پر خود انگریز بھی انگشت بدنداں ہیں۔ "ٹائمز لندن کے خصوصی نامہ نگار کا تأثر یہ ہے کہ مصر میں جسے بدنام کرنا ہو، اسے انگریزوں کا ایجنٹ کہہ دو، کام بن جائے گا۔ فوجی حکام اخوان کی تنظیم اور بڑھتی ہوئی طاقت سے پریشان تھے۔ اور کیا الزام عائد کرتے، انگریزوں ہی سے ساز باز کا بہتان باندھ دیا۔ اس بہتان کی تفصیلات میں طرح طرح کے جھوٹ شامل ہیں۔ ایک بہتان صریح یہ ہے کہ حسن عشماوی نے کرسول (CRESWEL) سے ان کی جائے اقامت پر دیر تک بات چیت کی، حالانکہ اس شام کو حسن عشماوی، الاخوان کے مزدوروں کے شعبے میں لکچر دے رہے تھے۔ مسٹر کرسول کا اپنا بیان یہ ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے حسن عشماوی کا نام بھی نہیں سنا تھا (اسٹیٹس مین: ۵۴/۱/۲۶)۔ اس کے علاوہ یہ الزام ہے کہ مسٹر ایونز (EVANZ) برطانوی سفارت خانہ کے عہدہ دار نے مرشد سے ملاقاتیں کیں۔ اس کا مسٹر ایونز اور اخوان دونوں کو اقرار ہے۔ لیکن یہاں اتنا اور سن لیجیے کہ مسٹر ایونز مرشد کو جانچنے آیا تھا۔ مرشد نے حکومت کے موقف کی پوری تائید کی اور فوراً ہی صلاح دمیجر) صالح سلام (وزیر الارشاد القومی) کو بلا کر گفتگو کی تفصیلات سنا دیں۔ کیا نفس ملاقات بھی جرم ہے؟ مسٹر ایونز کا کہنا یہ ہے کہ ملک کے مختلف الخیال

افراد سے ملنا اور ان کے افکار کا اندازہ لگانا ہمارے فرائض منصبی میں داخل ہے اور یہ کوئی جرم نہیں!

(۱۰) ایک بڑا الزام حکومت کا تختہ الٹنے اور نظم و نسق کی مشینری پر قبضہ کرنے کا ہے۔ یہ بڑا فرسودہ الزام ہے۔ اسی جرم میں کئی فوجی افسروں کو سخت سزائیں دی جا چکی ہیں اور اب ایک پوری جماعت پر یہ بہتان باندھا جا رہا ہے۔ جمال عبدالناصر نے دلیل یہ دی ہے کہ الاخوان کا اثر و نفوذ فوج اور پولیس میں بہت پھیل رہا ہے۔ تو کیا یہ بھی کوئی جرم ہے؟ کیا فوج اور پولیس قوم کے افراد نہیں؟ وہ اگر دین کی صحیح تعلیمات کو سمجھیں اور ان کو اختیار کریں تو اس میں کیا قباحت پیدا ہوتی ہے؟ اور یہ کونسا نیا انکشاف ہے؟ جمال عبدالناصر کو معلوم نہیں کہ وہ اس دینی دعوت سے متاثر تھا۔ اب اگر آج وہ حلفیہ عہد و پیمان اور میثاقِ بیعت کو بالائے طاق رکھ کر اخوان کے درپئے آزار ہو گیا ہے تو اس سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی؟ کیا اسلام اور مصر کے مسلمانوں کے حق میں مفید یہ ہوگا کہ فوج میں الحاد اور دہریت اور بدقوارگی کی وبائیں پھیلیں؟ یا خیر و برکت اس میں ہے کہ اس میں اسلامی نصب العین اور جذبہ و اخلاق کو فروغ حاصل ہو؟ اخوان کے ذریعے اگر فوج میں اسلامی اثرات بڑھ رہے ہیں تو یہ ان کی ایک قابلِ قدر خدمت ہے، نہ کہ جرم! جرم ہو سکتا ہے تو یہ کہ فوج اور پولیس کے افراد کو عملی سیاسیات میں کھینچ لایا جائے، سو یہ جرم اگر کسی نے کیا ہے تو خود انقلاب کے فوجی لیڈروں نے کیا ہے جو سیاسی اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ساری فوج میں عملی سیاسیات سے دلچسپی پیدا کرنے کا ذریعہ بن گئے ہیں، اور اس کے نتائج وہ بعد میں بھگتیں گے۔ اخوان اس حیثیت سے بری ہیں۔

یہاں تک تو واقعہ ہے، باقی اور حاشیہ آرائیاں جمال عبدالناصر کے دماغ کی پیداوار ہیں۔

(۱۱) آخر میں اُس واقعہ کو نمک مرچ لگا کر پیش کیا گیا ہے جو ۱۲ جنوری کو جامعہ قاہرہ کے احاطے میں واقع ہوا۔ اسی کے دوسرے ہی دن الاخوان المسلمون خلافِ قانون قرار دے دی گئی۔ اس لیے اس سلسلے میں طرح طرح کی غلط بیانیاں کی گئی ہیں۔

واقعہ صرف اتنا ہے کہ سال دو سال سے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اخوانی طلبہ چھائے ہوئے تھے۔ طلبہ کی انجمنوں ( ) کے انتخابات میں ۷۵ فیصد نمائندے اخوانی طلبہ

ہی میں سے منتخب ہوتے۔ جو نوجوان نہر سویز کے معرکوں میں کام آئے، اُن میں بھی اخوان سے تعلق رکھنے والوں کی بڑی تعداد تھی جمال عبدالناصر نے ہیئۃ التحریر قائم کی تو طلبہ میں بھی کام شروع کیا اور خاص طور پر طلبہ کے شعبہ کا خود نگران بنا۔ ۱۲ جنوری کو اخوانی طلبہ یونیورسٹی کے میدان میں یوم شہداء منا رہے تھے کہ اچانک ایک جیپ آئی جس پر کئی مسلح آدمی سوار تھے، اور وہ طلبہ میں سے یقیناً نہیں تھے۔ آتے ہی انہوں نے "اللہ اکبر اور العزۃ لمصر" کا نعرہ لگانا شروع کیا۔ اخوانی طلبہ نے بہت سمجھایا، مگر وہ نہ ملنے، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر جیپ والوں نے ریوالور سے کام لینا شروع کر دیا۔ مصر گاندھی جی کا دیس تو ہے نہیں، اُدھر سے بھی ترکی بہ ترکی جواب ملا اور جیپ والے ایک طرح سے گھیرے میں آ گئے۔

اب یہاں چند امور خاص طور پر قابلِ غور ہیں:۔

i۔ جلسہ خاص طلبہ کا تھا۔ فوجی جیپ ہیئۃ التحریر کے فوجی کارکنوں کو لے کر کیوں آئی؟

ii۔ آنے والوں نے فوراً ہی فائرنگ شروع کر دی۔

iii۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ (ہیئۃ التحریر سے متعلق) بھی لاٹھیاں اور ڈنڈے چھپائے ہوئے تھے۔

iv۔ یونیورسٹی پولیس دروازے پر کھڑی منہ دیکھتی رہی۔

v۔ اخوانیوں کے اصرار کے باوجود حادثہ کے چھ گھنٹہ تک پولیس تحقیق کے لیے نہیں آئی۔

کیا ان قرائن سے نہیں معلوم ہوتا کہ یہ واقعہ خاص سازش کے تحت ظہور میں آیا اور یہ منصوبہ خاص مقصد سے تیار کیا گیا تھا؟

ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے الزامات ہیں، جن سے ہم سر دست صرفِ نظر کرتے ہیں۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ الاخوان المسلمون خلافِ قانون کیوں قرار دی گئی؟ اور یہ سازش اور یہ منصوبہ کس لیے؟ میری نگاہ میں اس کی دو بڑی وجہیں ہیں:۔

ایک وجہ — اور فوری وجہ — تو یہ ہے کہ انگریزوں سے دب کر صلح کرنے اور امریکہ سے مُنہ مانگی امداد لینے کی راہ میں الاخوان المسلمون حائل تھی۔ یہ لمبی چوڑی باتیں کرنے والے فوجی سورما انگریزوں اور امریکیوں کے سامنے جس طرح سرِ تسلیم خم کر رہے ہیں اُس کا حال عام لوگوں کو نہیں معلوم لیکن آہستہ

آہستہ معلوم ہو جائے گا۔ درحقیقت "اخوان" پر سازباز کا الزام رکھنے والے خود سازباز کے لیے راستہ ہموار کر رہے ہیں[1]۔

دوسری ـــــ اور اصل وجہ ـــــ یہ ہے کہ آمریت، اور خصوصاً فوجی آمریت، اپنا حریف نہیں دیکھ سکتی۔ پھر حریف بھی ایسا حریف ہے جو با اصول ہو، منظم ہو اور رائے عام پر اثر انداز ہو سکتا ہو[2]۔

"ٹائمز لندن" کے نامہ نگار نے فوج کے عزائم کا خلاصہ جن الفاظ میں دیا ہے ہم اُن پر تحریر کو ختم کرتے ہیں :۔

"ہم دین کے نام پر آئندہ کسی رجعت پسندانہ ٹریجیڈی کا اعادہ نہیں ہونے دیں گے"!

مضمون خاصا لمبا ہو گیا۔ اور کہنے کی بہت سی باتیں رہ گئیں۔ پھر کسی فرصت میں انشاء اللہ!

یار زندہ صحبت باقی۔

---

[1] جیسے جماعت اسلامی پر "امریکی امداد" کا الزام دھرنے والے وہ ہیں جو خود "امریکی امداد" کے لیے بے چین تھے۔

[2] تیسری وجہ ـــــ اور مستقل وجہ ـــــ یہ بھی ہے کہ مصر کے انقلابی فوجی افسر مصری معاشرہ کی تعمیر جس غیر اسلامی فرنگی نقشے پر کرنا چاہتے ہیں اور عوام کے ذہن و کردار کو آرٹ اور کلچر کے جس رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں اس میں کسی اسلامی دعوت و تحریک کا وجود رخنہ انداز ہوتا ہے، لہٰذا یہ کانٹا راستے سے ہٹائے بغیر چارہ نہ تھا۔

رسائل و مسائل

حدیث اور فقہ کے متعلق چند استفسارات

سوال:- چند متفرق امور کے بارے میں سوالات ارسال ہیں مختصر جوابات دے کر مطمئن فرمائیں

(۱) شیطان اور نفس امارہ کے حملوں سے بچنے کے لیے کون کون سے شرعی اصول وضوابط اختیار کیے جائیں تاکہ حلاوتِ ایمان نصیب ہو اور کفر و عصیان سے دل بیزار ہو۔ کیا اوراد و وظائف بھی اس مقصد کے حصول میں معاون ہو سکتے ہیں؟

(ب) اگر حیاتِ طیبۂ نبویہ کے واقعات کو ماخذِ دین کی حیثیت حاصل ہے اور ان سے تشریعی احکام کا انتزاع ناگزیر ہے تو ان کی کتابت و تدوین عہدِ نبوی میں کیوں نہیں ہوئی؟

(ج) یہ بات مشہور ہے اور کتبِ متداولہ نیز ابنِ حزم کی اجتہاد و قیاس کے خلاف یورش سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے، کہ امام داؤدؒ ظاہری اور اُن کے اتباع اجتہاد، استنباط، قیاس اور استحسان کے شدید مخالف ہیں لیکن خود ابن حزم ہی کی کتابوں سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اجتہاد کے عادی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ حقیقت الامر کیا ہے۔ کیا یہ کوئی تعبیر کا فرق ہے یا سچ مچ وُہ اجتہاد کے قائل نہیں ہیں۔ اور اگر نہیں ہیں تو اُن کے اپنے اجتہاد کی توجیہ اور پس منظر کیا ہے؟

(د) اہل تشیع کی کتبِ حدیث اور اُن کے مؤلفین کا کیا پایہ ہے؟

(ہ) سب سے پہلے حجیتِ حدیث کا انکار کس نے کیا ہے، اس کی نوعیت و علّت کیا تھی؟

جواب: آپ کے ارشاد کے بموجب مجمل جوابات حاضر ہیں۔

ا۔ نفس امارہ سے بچنے کے لیے ایک ہی کارگر ہتھیار ہے اور وہ ہے خوفِ خدا کے استحضار کے ساتھ محاسبۂ نفس۔ اوراد و وظائف اس میں مددگار ہو سکتے ہیں مگر دو شرطیں لازم ہیں۔ ایک یہ کہ ذکر کے ساتھ فکر بھی ہو، دوسرے یہ کہ ابتداع سے پرہیز کر کے اُن اذکار و ادعیہ پر قناعت

کی جائے جو قرآن یا احادیث صحیحہ میں وارد ہیں۔

۲۔ احادیث کے منضبط نہ کیے جانے کی وجہ سمجھنے کے لیے اُس وقت کے ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اُس وقت لکھنے پڑھنے والے کم تھے اور سامانِ کتابت اور بھی زیادہ کم یاب تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید کو محفوظ کرنے کے لیے بھی کھجور کے پتے، جھلیاں، تختیاں وغیرہ استعمال کی جاتی تھیں۔ اب یہ آخر کس طرح ممکن تھا کہ حضور کے ساتھ ہر وقت ایک کاتب کاغذ قلم لیے لگا رہتا اور تمام حرکات و سکنات قلمبند کرتا رہتا۔ ویسے بھی یہ بات کچھ غیر فطری ہے کہ ایک آدمی کے ساتھ سفر و حضر میں اور خلوت و جلوت میں کاتبین لگے رہیں اور ہر تقریر، گفتگو، فعل، ترکِ فعل، سکوت وغیرہ کو لکھتے رہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب کتابت کا اصول لازم کر دیا جاتا تو پھر آنحضور کے بعض اعمال و اقوال کو اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا تھا اور انہیں بتمام و کمال احاطۂ تحریر میں لانا قطعاً محال اور عملاً ناممکن تھا۔ آپؐ کا قول و فعل بلاشک و شبہ حجت ہے اور اسے ہونا ہی چاہیے، لیکن حجت ہونے کے ساتھ آخر یہ کب ضروری ہے کہ ہر چیز ہر وقت فوراً لکھ ہی لی جائے۔ جب یہ ثابت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کا حجت ہونا صحابۂ کرام کے ذہن نشین تھا تو یہ بات عین تقاضائے عقل و فطرت ہے کہ انہوں نے ہر بات کو غور سے دیکھا اور سنا ہوگا، آپس کے معاملات میں وہ ان اقوال و افعال سے سند لاتے ہونگے اور ہر معاملہ میں یہ خیال رکھتے ہونگے کہ کیا کچھ حضور سے ثابت ہے اور کیا کچھ ثابت نہیں ہے۔ یہ سنتِ نبوی کی حفاظت کا فطری راستہ تھا اور یہی امت نے اختیار کیا۔ قرآن تو ایک قابلِ کتابت چیز تھا اور مختصر تھا، اس لیے لکھ لیا گیا۔ مگر حضور کی تئیس سالہ زندگی کے احوال، حرکات و سکنات کو اور اُس ماحول کو جس میں حضور نے یہ سب کام سر انجام دیے عالمِ واقعہ میں آتے ہی عالمِ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ مجرد ظہور کے وقت تو یہ سارے امور ذہنوں اور حافظوں میں ہی محفوظ کیے جا سکتے تھے اور دیکھنے والوں سے سننے والوں تک زبانی ہی پہنچائے جا سکتے تھے۔ چنانچہ یہ عمل پورے استیعاب، تواتر اور تسلسل کے ساتھ جاری رہا حتیٰ کہ باقاعدہ اور مفصل تدوین و کتابت کے لیے جملہ ساز و سامان اور آسانیاں مہیا ہوگئیں اور سنت کا یہ عظیم الشان ذخیرہ سینوں سے سفینوں میں منتقل ہو گیا۔

۳۔ اجتہاد و استنباط اور قیاس و استحسان ایک ایسی چیز ہے جس سے کسی طرح مفر نہیں ہے۔ جو شخص بھی محدود احکامِ منصوصہ کو غیر محدود احوالِ انسانی پر منطبق کرنے کی کوشش کرے گا، اسے لامحالہ ان چیزوں

سے کام لینا پڑے گا۔ اصل اختلاف ان چیزوں کے بالفعل استعمال میں نہیں ہے بلکہ استعمال کی کثرت وقلت میں ہے، یا پھر ان الفاظ و اصطلاحات میں ہے جن سے ان معانی کو تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کی تعبیر پر دوسرا شخص قدح کرتا ہے، اور لوگوں میں یہ مشہور ہو جاتا ہے کہ وہ سرے سے اس چیز کا قائل ہی نہیں، ایک شخص اختیار پر عملاً یا قولاً زور دیتا ہے اور دوسرا اس پر کچھ اس شان سے معترض ہوتا ہے کہ گویا اس کا اعتراض کثرتِ استعمال پر نہیں بلکہ نفسِ شے کے استعمال پر ہے۔ ان اشارات کو نگاہ میں رکھ کر آپ نہ صرف امام داؤد ظاہری اور ابن حزم کے مسلک کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ ان اختلافات کی حقیقت کو بھی پا سکتے ہیں جو مثلاً اہل الرائے اور اہل الحدیث میں قیاس و رائے کے استعمال پر، اور امام مالک و امام شافعی میں استحسان و مصالح مرسلہ کے مسئلے پر ہوئے ہیں۔

(۴) اہل تشیع کی فقہ و حدیث کا وسیع مطالعہ کیے بغیر اس کے بارے میں کوئی تفصیلی اور محققانہ رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ فی الجملہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ کہ ہمارے اور ان کے ذخیرۂ حدیث میں بنیادی اختلاف یہ ہے کہ وہ صحابہ کی عظیم اکثریت کو چھوڑ کر صرف اہل بیت کی روایات پر اعتماد کرتے ہیں اور اہل بیت کے بارے میں بھی اُن کا نقطۂ نظر محدود ہے۔ لیکن ہم اہل سنت اہل بیت اور جملہ صحابہ کی روایات لیتے ہیں۔ نیز اُن کے راویوں میں بڑی تعداد ایسے غالی حضرات کی ہے جو اپنے خیالات میں نہایت متشدد تھے اور انہوں نے واقعات کو اپنے مخصوص رجحانات میں رنگ دیا ہے۔

(۵) غالباً حجیتِ حدیث کے اولین منکرین خوارج اور معتزلہ ہیں۔ خوارج نے اس لیے حدیث کا انکار کیا کہ ان کے مسلک کی اکثر باتیں حدیث کے خلاف پڑتی تھیں اور معتزلہ نے اس لیے انکار کیا کہ دوسرے مذاہب اور فلسفیانہ مسالک کے لوگوں سے بحثیں کر کر کے انہوں نے اسلام اور اس کے معتقدات کی حقانیت کا اثبات جن دلائل پر موقوف سمجھ لیا تھا اُن میں سے اکثر حدیث سے ٹکراتے تھے۔ اسی طرح مناظروں کے بعد انہوں نے عقائد کی جو شکل بنائی تھی وہ بھی احادیث سے مطابق نہ تھی، اور بعض حدیث سے ثابت شدہ چیزوں کو عقلی مناظروں میں صحیح ثابت کرنے کی انہیں کوئی راہ نہ ملتی تھی۔ یہ دشواری اپنے عقلی مزعومات کی بنا پر انہیں بعض آیاتِ قرآنی کے بارے میں بھی پیش آئی تھی لیکن قرآن کا انکار ناممکن تھا اس لیے آیات کی توجیہ و غریب اور دلچسپ تاویلیں کی گئیں اور احادیث کا سرے سے انکار کر دیا گیا۔

(بقیہ اشارات)

موجودہ دور کی ناسازگار ملحدانہ و مادہ پرستانہ فضا میں جو لوگ "اسلامی دستور" کے حامی ہیں، اُن کو ثبوت دینا چاہیے اس بات کا کہ وہ اس کی رکھوالی کے لیے مستعد بھی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر ان کی روش یہ ہو کہ ایک طرف وہ اس پودے کو ڈھول ڈھمکے کے ساتھ نصب کریں، اور دوسری طرف بادِ سموم کے جھونکوں کو بلا بلا کے اس پر کرم فرمائی کرنے کا موقع بھی دیں تو اس تضاد کی قلعی بہت جلد کھُل کے رہے گی۔

جیسا انقلابی دستور ہمارے ملک میں بن رہا ہے اُس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جو حکمراں طاقت اس کی تدوین کا سہرا اپنے سر باندھ رہی ہے۔ اس کے زاویہ نظر کے "قطب نما" کی سوئی کے مثبت اور منفی دونوں سرے اپنا رُخ بدل کر ٹھیک اپنی جگہ پر آجائیں۔ اس کی محبت اور نفرت، اس کی پسند اور ناپسند، اس کی یگانگت اور غیریت کا معیار اس کے دستوری فیصلوں کے مطابق بدلنا چاہیے۔ اسلامی دستور بنا کر کام کرنا ہو تو ناگزیر ہے کہ غیر اسلامی عناصر سے آپ کی دُوری بڑھے اور ملک کے تمام اسلامی عناصر کا تعاون حاصل کرنے کے آپ درپے ہوں لیکن اگر عملی پالیسی اس کے برعکس جارہی ہو تو عوام آپ کی نیتوں پر شبہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

بد قسمتی سے پہلے بھی یہاں صورتِ واقعہ یہ پیش آئی تھی کہ قرار دادِ مقاصد جب پاس کی گئی تو عین اس لمحے اسلامی دستور کے عوامی مطالبہ کو لے کر اٹھنے والی اصل طاقت زیرِ عتاب تھی، اس گناہ کے تین مجرم جیل میں تھے اور قرار دادِ مقاصد پاس کرتے ہی جو پہلا کارنامہ سرانجام دیا گیا وہ یہ تھا کہ ان کی میعادِ نظر بندی میں مزید چھ ماہ کا اضافہ کیا گیا ٹھیک ویسی صورت اب بھی پیش آئی ہے کہ جب دستوری رپورٹ زیرِ بحث آئی تو اس وقت جماعت اسلامی کے رہنما اور اس کے نمایاں کارکن ابتلاء سے گذر رہے تھے۔ مولانا مودودی کو پھانسی کی کوٹھری سے گذار کر ۱۴ سال قید بامشقت میں ڈالا جا چکا تھا اوپر سے انڈمنٹی ایکٹ کے ذریعے عدالتی اپیل کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اور اب جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کو نئی اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کا فیصلہ کر چکنے کے بعد بھی مولانا مودودی اور ان کے ہم جرم

رفقاء کو عوامی مطالبہ کے علی الرغم حکومت رہا کرنے پر تیار نہیں ہو رہی۔ ایک طرف اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے فیصلے کرنا اور دوسری طرف ٹھیک اُس طاقت کو دبانے کی مساعی کرنا جو اس کام کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتی ہے، بڑے ناقابلِ اعتماد ذہنی تضاد کی دلیل ہے۔

فرقہ بندیت کے ان سارے مظاہر کو ہم جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ سامنے لا کر مسلم لیگی قیادت کو مشورہ دیتے ہیں کہ سنبھلنے کے آخری موقع سے فائدہ اٹھائے، ورنہ عوام میں اس کے وقار کا خاتمہ پوری تیز رفتاری سے ہوتے ہوئے جس آخری حد پر آچکا ہے اُس کا اندازہ اگر مغربی پاکستان کے حالات سے نہ ہو سکتا ہو تو مشرقی پاکستان کے حالات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ قیادت کوئی بھی ہو، اگر قائم رہ سکتی ہے تو قوم کی اجتماعی تمناؤں اور امنگوں کو پورا کر کے، اور عام لوگوں کا اعتماد اور اطمینان حاصل کر کے ہی رہ سکتی ہے۔ عام لوگوں کو اضطراب میں ڈال کر اور ان کے اجتماعی رجحانات کو پامال کر کے کسی بھی اقتدار نے پائداری کبھی حاصل نہیں کی ہے۔ اور کسی قیادت کی ساکھ، نعروں اور تقریروں اور لفظی فیصلوں سے نہیں جمتی، اس کی عملی روش سے جمتی ہے۔ سیاست کی دنیا میں نعروں اور تقریروں اور فیصلوں کی ہنڈیاں چلتی ضرور ہیں، مگر لوگ ان کو عملی کارناموں کی مارکیٹ میں جب بھنانے کیلئے لاتے ہیں تو ان کو مایوس لوٹانے والے صرافوں اور بینکروں کی ساکھ آناً فاناً ختم ہو جاتی ہے اور پھر یہ سیاسی ہنڈیاں سونے کے حروف میں بھی لکھ کر پیش کی جائیں تو ان کو ردی کے پرزے سے زیادہ کبھی وقعت نہیں دی جاتی۔ اور پبلک آپ کے "اسلامی دستور" کی گراں بہا ہنڈی کو آپ کے عملی کارناموں کے صرافہ میں بھنانے کے لیے منتظر کھڑی ہے۔

مطبوعات جماعت اسلامی پاکستان

دستور پاکستان

کتاب		
دستوری سفارشات پر تنقید	۳	۰
دستوری سفارشات پر تنقید و تبصرہ	۰	۱
دستوری تجاویز	۱	۰
اسلامی دستور کی بنیادیں	۲	۰
اسلامی دستور کی تدوین	۱۲	۰
جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد	[illegible]	۰
منشور جماعت اسلامی	۳	۰

معیشت

کتاب		
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۸	۰
سود حصہ اول (زیر طبع)		
سود حصہ دوم	۰	۳
اشتراکیت اور نظام اسلام	۶	۰
مسئلہ ملکیت زمین (زیر طبع)		

معاشرت و مسائل عمرانی

کتاب		
پردہ (زیر طبع)		
حقوق الزوجین	۰	۲
اسلام اور ضبط ولادت	۱۲	۰
پاکستانی عورت دوراہے پر (زیر طبع)		

کتاب		
تنقیحات	۰	۳
نیا نظام تعلیم	۶	۰
ایک اہم استفتاء	۳	۰
اسلام کا نظام حیات	۱۰	۰
رسائل و مسائل حصہ اول (زیر طبع)		
,, حصہ دوم (زیر طبع)		

تحریک اسلامی اور نظام حیات

کتاب		
تجدید احیائے دین	۱۲	۱
دستور جماعت اسلامی (جدید)	۸	۰
روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۰	۱
,, ,, ,, حصہ دوم	۱۲	۰
,, ,, ,, حصہ سوم	۰	۲
,, ,, ,, حصہ چہارم (زیر طبع)		
,, ,, ,, حصہ پنجم	۰	۲
,, ,, ,, حصہ ششم (زیر طبع)		
,, ,, ,, حصہ خواتین	۱۲	۰
جماعت اسلامی کی دعوت	۶	۰
دعوت دین اور اس کا طریق کار	۱۲	۲
ہدایات	۶	۰
جماعت اسلامی اس کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل	۰	۱
دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات	۸	۲

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن

جلد دوم

سورۃ الاعراف تا سورۃ بنی اسرائیل

تفہیم القرآن جلد دوم کی طباعت کا کام عنقریب شروع ہو جائیگا۔ مکمل ہونے پر بلا تاخیر فرمائشوں کی تعمیل اسی ترتیب سے کی جائے گی جس ترتیب سے فرمائشیں موصول ہوں گی اس لئے جلد از جلد جلد دوم کی فرمائشوں سے مطلع فرمائیں۔

تفہیم القرآن جلد اول طبع دوم میں حسب ذیل ہدیوں کی جلدیں موجود ہیں۔

ہدیہ قسم اول	۲۰/۱۲،	۲۲/۱۲	۲۴/۱۲ مطلا	۳۱/-	۳۳/-
ہدیہ قسم دوم	۱۸/۴	۲۰/۱۲	۲۲/۱۲	۲۹/-	۳۱/-
ہدیہ قسم سوم	۱۱/-	۱۱/۸	۱۲/۸	۱۳/۴	

دیگر اخراجات بذمہ خریدار

مکتبہ کی سول ایجنسیاں تفہیم القرآن براہ راست ہم سے طلب کریں

ملنے کا پتہ:

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ لاہور